

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_I 188034

UNIVERSAL
LIBRARY

حیاتِ سعدی

یعنی

فیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح عمری اور

ان کی تمام نظم و نثر پر جید اجدادِ رویو
مرتبہ

شمس العلماء خواجہ الطاف حسین حالی

صحیح

جناب مولوی حافظ جلال الدین احمد جعفری نے یہی

منشی محمد اسماعیل صاحب منیر کے اہتمام سے

طبع النور احمدی واقعہ آباد سے چھپکر شائع ہوئی

قیمت فی جلد ۷۰

جلد ۱

بایاتِ عمر خیام

مقدمہ و شرح و ترجمہ اُردو

مشرعہ

جناب مولوی حافظ جلال الدین احمد جعفری رشتی

مدرس عربی و فارسی گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد

مقدمہ حکیم عمر خیام کے حالات اور ان کی رباعیوں کی خصوصیات اور باعتبار
مضامین کے اس کے اقسام بیان کئے گئے ہیں مقدمہ کے بعد ہر رباعی کے
نیچے اس کا ترجمہ اور شرح لکھ دی گئی ہے۔ اسی قطع پر سفید پکڑ دیا
گیا کاغذ پر نہایت خوشنما اور چمکدار ہے۔ قیمت فی جلد عس

طے کا پتہ

مینجر انوار احمدی پریس

الہ آباد

فہرست مضامین

صفحہ	مضمون	صفحہ	مضمون
۱	کا ذکر۔	۱	چ
۲	آس بات کی وجہ کہ گلستاں بہت غور و فکر سے ایک مدت درمیں لکھی گئی ہے۔	۲	پہلا حصہ
۱۰	گلستاں کی ترجیع تمام نگلی اور پھیلی شروں پر اور مقامات بدلی تباہی کا پس نامہ نہ	۱۰	۱ اور خیرآز کا حال۔
۲۵	تاریخ و شہادت کا ذکر۔	۱۱	۲ کے بچپن کا حال۔
۳۴	تین کتابوں کا ذکر جو گلستاں کے طرز پر لکھی گئی ہیں۔	۲۵	۳ کی تیاری کا حال۔
۴۵	گلستاں اور بہارستان جامی کا مقابلہ۔	۳۴	۴ کی سیاحت کا حال۔
۴۸	گلستاں اور غارستان کا مقابلہ۔	۴۵	۵ سے وطن میں آنے اور خیرآز میں آنے کا حال۔
۵۶	گلستاں اور پریشاں کا مقابلہ۔	۵۶	۶ کی وفات اور اس کے مدفن کا حال۔
۶۰	گلستاں کے استعار اور فقرے جو ضربیں ہو گئے ہیں۔	۶۰	دوسرا حصہ
۱۰۳	ہوستان	۶۰	۷ کی شاعری کی شہرت اس کی زندگی میں
۱۰۵	بوستان اور شاہنامہ کا موازنہ۔	۶۳	۸ کے کلام پر لوگوں کی رائیں۔
۱۱۱	بوستان اور سکندر نامہ کا موازنہ شاہنامہ اور مثنوی معنوی کے ساتھ۔	۶۴	۹ اور شکسپیر کے کلام میں مماثلت۔
۱۱۲	بوستان اور غزلیات شیخ علی ہمدانی کا مقابلہ۔	۶۴	۱۰ ات شیخ کی تفصیل۔
۱۱۴	گلستاں اور بوستان کی دو قافیہیں اور خوبیاں جن کے سبب سے دونوں کتابیں مقبول خاص و عام ہوئی ہیں۔	۶۹	۱۱ ناں اور بوستان۔
		۶۹	۱۲ دن کتابوں کی اجمالی ترویج۔
			۱۳ ناں کی ترجیع بوستان پر
			۱۴ شاہنامہ مثنوی معنوی گلستاں و بوستان
			۱۵ دیوان حافظ کا ذکر۔
			۱۶ دون کتابوں کی شہرت و مقبولیت کے
			۱۷ جداگانہ اسباب۔
			۱۸ ناں کے ترجموں اور تخریج اور ترتیب

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۱۹۲	نطائبات و ہزلیات و مضحکات	۱۵۰	غزلیات شیخ
۱۹۶	قصائد عربیہ کا ذکر	۱۵۲	قدما کی غزل پر شیخ کی غزل کی ترجیح کے وجوہ۔
۱۹۶	مرثیہ ہنداد کے اشعار۔		شیخ کی غزل کی وہ خصوصیتیں جو قدما کی غزل میں بہت کم پائی جاتی ہیں۔
	خاتمہ	۱۶۰	شیخ کی غزلیات کے نونے۔
۲۰۴	شیخ کے حالات اور اُس کی عالم شاعری پر اجمالی نظر۔		شیخ اور قدما کی غزل میں باریک فرق۔
۲۰۴	شیخ کے توابع جسمانی اور مذہب کا ذکر۔		شیخ اور اُس کے متبعین کی غزل سے سوسائٹی پر کیا اثر ہوا۔
	شیخ کے صوفی داعی اور شاعر ہونے کا ذکر۔	۱۷۱	قصائد وغیرہ
	شیخ کی محصلتیں۔		شیخ سے پہلے مسلمانوں میں قصید گوئی کا کیا حال تھا۔
	شیخ کے کمال شاعری اور سنجیدگی خیالات کے اسباب۔		شیخ اور قدما کے قصیدے میں تفاوت کی وجہ۔
	شیخ کو اور شعرا پر ترجیح دینے کے وجوہ۔		شیخ قصیدہ کس غرض سے لکھتا تھا۔
	ایران میں جو آمودوں کے عشق پر شعری بنیاد رکھی گئی ہے اُس کے متعلق معصفت کی رائے۔		جو غرض قصیدے سے ہونی چاہیے وہ قدما کے قصیدے سے حاصل نہیں ہوتی۔
			قصائد شیخ کے اشعار بطور نمونہ کے مجموعہ صاحبیہ کے اشعار بطور نمونہ کے

ہیں۔ جا بجا چٹے اور تداہاں جاری ہیں صحراے شاپور میں جو کہ خیر از کے نواح میں ہے
ایک سیح قطعہ ہے جسکا نام شعب بٹوان ہے۔ عرب کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ دنیا میں چلے
نقحہ گا ہیں ایسی ہیں جن کا کہیں نظیر نہیں۔ جھنڈا سر قندہ سحر طہ و مشق
فواکله اور شعب بٹوان +

ابابک ابو بکر بن سعد زلی جس کے عہد حکومت میں شیخ نے گلستان لکھی ہے
ہمیشہ فخر سے کہا کرتا تھا کہ میرے ملک میں دو چہرے ایسی ہیں جو خون اور اطمینان کی
حالت میں باو شاہوں کے لیے ناگزیر ہیں خون کی حالت میں قلعہ سفید اور اطمینان
کی حالت میں ترہمت گاہ شعب بٹوان۔ اکثر شعراے عرب نے اس قطعہ کی تعریف
میں قصیدے لکھے ہیں جن میں سے سلاھی شاعر کا قصیدہ جو عند اللہ ذیلی کی
فراہش سے لکھا گیا تھا بہت مشہور ہے۔ ایک اور شاعر کہتا ہے

اِذَا اُسْرَتْ اَلْمَحْزُونُ مِنْ رَاثِلِ الْعِثَّةِ عَلٰی شُعْبِ بَطْوَانَ اَسْتَوَاعَ مِنْ اَلْكَرْبِ

ترجمہ جب غمگین آدمی قلعہ پرے شعب بٹوان کی فضا کو دیکھتا ہے تو اسکی تمام کفایتیں دور ہو جاتی ہیں
فارس کے یوے عراقی عجم میں جاتے ہیں۔ گرم پانی کے چھتے اور سفید کانیں خدر
میں موجود ہیں۔ فارس کے آثار قدیمہ دنیا کے ان عجائبات میں سے ہیں جن کو اگلے
زمانے کے لوگ جن اور پری کے کام سمجھتے تھے جیسے تخت جمشید۔ نقش شاپور۔ و
فریدوں۔ اور خانہ زردشت بلن کا مفضل حال ایران کی انگریزی تاریخوں میں مذکور ہے

اس عند عرب بعد شیب کی زمین اور عند سر قند ایک نہایت گاہ قوند کے قریب بھی غوطہ بھی
کہتے ہیں اور خود شیخ ایک سرگاہ و مشق میں تھی۔ اُنہو جموں میں ایک پہنچا مقام تھا اور ایک ندی تھی
اُس کو تہذیب کہتے تھے یہ تینوں مقام اور شعب بٹوان دنیا کے چار بہشت جیسے جاتے تھے

مذکور ہے انہیں آثار قدیمہ کی نسبت عرفی شیرازی نے کہا ہے ۵
 افقش و نگار درو دیوار شکستہ آثار پر بدست صنایع عجیب را
 اسکے سوا اور بہت سی خصوصیتیں ایسی ہیں جن کے دیکھنے سے انسان کے قوسے
 میں شگفتگی اور بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ فارس کے اکثر شہر و قریہ
 سمجھے گئے ہیں۔ جیسے کہ زرد۔ میبذ۔ گاندون۔ خیر و نازآباد۔ بیضا۔ خیر از وغیرہ ان خصوصیات
 میں کثرت سے علماء و فضلا اور ادیب و شاعر پیدا ہوئے ہیں جن کی تصنیفات مسلمانوں
 میں اب تک موجود ہیں۔ خصوصاً شیراز جو کہ صد ہا سال ایران کا پایۂ تخت و پایۂ
 مسلمان ایرانیوں نے جس طرح قہم کو دارالموہبین اور سز کو دارالعتقاد کا خطاب
 دیا ہے اسی طرح شیراز کو دارالہلم کے لقب سے ملقب کیا ہے۔ اگرچہ شیراز کا علم
 فضل زمانے کے انقلاب اور سلطنت اسلامیہ کے تشرل سے اب نہایت پست
 حالت میں ہے لیکن اُس کی موجودہ نسلوں کی حالت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی
 قدیم جرگی اور پروری کے نقشے میں اب تک بہت ہیں۔ حاجی طاعت علی قاسم نے
 نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ شیراز کے چھوٹے بڑے جوان لوہوڑے سبباً و
 مجلسوں پر فریفتہ ہیں۔ کسب معاش اس قدر کرتے ہیں کہ کسی کے محتاج نہ ہوں
 تھوڑی سی آمدنی پر قانع رہتے ہیں اور ہمیشہ سیرگاہوں اور قہوہ خانوں میں جمع ہوتے ہیں
 شیراز کی بنیاد اسلام کے زمانے میں پڑی ہے محمد بن قاسم جس نے مسلمانوں
 میں سب سے اول ہندوستان پر لشکر کشی کی ہے شیراز کا بانی ہے یہ شہر پہلی صدی ہجری
 کے اخیر میں ایک نہایت سرسبز و مہذب و آباد کیا گیا ہے۔ تقویم البلدان
 میں لکھا ہے کہ شیراز کے ممالک بہت وسیع اور بازاریروں سے ہر گھر نہایت جاری ہے

شاید ہی کوئی مکان ایسا ہو جس میں ایک عمدہ باغ اور نہر نہ ہو۔ پھر صفاریوں اور زبیدیوں کے عہد میں شیراز نے آدھ بھی زیادہ وسعت اور رونق حاصل کی۔ عضدالدولہ دہلی کے زمانے میں اس کی آبادی اس درجے کو پہنچی کہ شہر میں اہل لشکر کی گنجائش نہ رہی اور نہر کے باہر ایک جدید عمارت بنائی گئی جس کا نام شوق الامیر رکھا گیا اور اس کے بیٹے صمصام الدولہ نے اس جدید عمارت کے گرد پختہ خضیل کھنچوائی۔

شیراز کی آب و ہوا نہ زیادہ گرم ہے نہ زیادہ سرد، بلکہ نہایت معتدل اور خوشگوار ہے۔ شیخ سعدی اور خواجہ حافظ اور اکثر پرانے اور نئے شاعروں نے شیراز کی تعریف میں اشعار اور قصیدے لکھے ہیں ازاں جملہ خواجہ حافظ کا یہ شعر مشہور ہے۔

بدھ ساتی ہے باقی کہ در جنت خواہی یافت کنا ر آب ز کنا باد گلگشت نصلا را

شیخ علی حری نے بارہویں صدی ہجری میں جب کہ شیراز کی رونق باطل باغیچہ فیضی اس کو دیکھا ہے وہ اپنے سوانح عمری میں اس کی بہت سی تعریف کے بعد لکھتا ہے کہ شیراز کی آب و ہوا دماغ کے ساتھ نہایت مناسبت رکھتی ہے۔ جس قدر چاہو کتاب کے مطالعہ اور فکر و غور مضامین میں مصروف رہو کبھی جی نہ اکتا تیگا۔

اس میں شک نہیں کہ شہر کا قدرتی موقع اور آب و ہوا کی خوبی اور علاقہ کی لطافت و خوش اسلوبی۔ دانشمندی کے خیالات اور خوش طبعی پر عجیب اثر رکھتی ہے۔ یہی سب ہے کہ شیراز کے اکثر مشائخ اور علماء و شعرا پاکینو طبع اور لطیف و ظریف ہوئے ہیں۔ شیخ نے ہر سال کے دیباچے میں اہل شیراز کو ان تمام اشخاص پر ترجیح دی ہے جن کے

۱۔ صفاریوں میں تین بادشاہ ہیں چالیس برس ان کی سلطنت رہی۔
۲۔ زبیدیوں میں آٹھ بادشاہ ہوئے جن کی حکومت ۲۲۰ برس رہی۔

وہ حالات سفر میں ملا تھا۔ شیراز سے جس قدر علما و مشائخ و شعرا و مصنفین ابتدا سے اخیر تک آئے ہیں اور جن کا حال مسلمانوں کے تذکروں میں جا بجا مذکور ہے ان کی تعداد سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس شہر کی خاک علم و ہنر کے ساتھ کس قدر منہایت رکھتی ہے اور شیخ کے کلام کی بے نظیر شہرت اور مقبولیت سے ثابت ہے کہ شیخ کا وجود بھی شیراز کے لیے کچھ کم باعث افتخار نہ تھا +

شیخ کا نام - نسب - ولادت اور بچپن

اس کا نام شہرت الدین اور مصلح لقب اور سعودی تخلص ہے۔ مسرگودا و سلی نے اس کی ولادت مسندہ مطابق ۱۱۳۲ھ کو بھی ہے مگر تحقیق یہ ہے کہ ۱۱۳۲ھ سال مذکور سے بہت برسوں پہلے ۱۱۷۱ھ تا ۱۱۸۱ھ مظفر الدین تغلق بن زنگی کے عہد حکومت میں پیدا ہوا ہے۔ شیخ کی ولادت کے کئی برس بعد ۱۱۸۱ھ تا ۱۱۹۱ھ سعد زنگی اپنے بھائی تغلق بن زنگی کی جگہ تخت شیراز پر ٹھکان ہوا تھا۔ چونکہ شیخ نے سعد زنگی کے عہد میں شعر کہنا شروع کیا تھا۔ اور نیز شیخ کا باپ عبد اللہ شیرازی سعد کے ہاں کسی خدمت پر مامور تھا۔ اس لیے اس نے اپنا تخلص سعدی قرار دیا۔ شیخ کا

۱۱۷۱ھ میں کی ولادت کا سال کسی نے نہیں لکھا مگر سال وفات سے لکھا ہے یعنی ۱۱۷۱ھ جو اس کی عمر ۱۱۷۱ھ تا ۱۱۸۱ھ تک کی بتاتی ہے پس کم سے کم عمر ۱۰ سے اس کی ولادت مسندہ میں تقریباً پانچ ہی لیکن اس سے لا وہ ہوتا ہے کہ ابو الفتح ابن جوہری جو بغداد میں اشکا طیلیل لغہ را ستاد تھا اس کی وفات کے وقت جو کہ قلعہ ۱۱۷۱ھ میں ہوئی ہے شیخ کی عمر ۱۰ برس زیادہ ہو اور باطل فطرت واقع ہے اسی لیے اس کی عمر ۱۰ برس زیادہ تسلیم کرنی چاہئے +

۱۱۷۱ھ کو کوستا انہ شیش میں لکھا ہے حالانکہ سعدی اسکے وقت میں پیدا ہو رہا تھا اس کا سبب یہ ہے کہ کوستا ان تک ۱۱۷۱ھ میں بادشاہ میں بدکر کے عہد میں لکھی گئی ہے پوس شاہل و شیش سے وہ بادشاہ فردوسی جوابدہ کرے پہلے تھے زندہ جو سعدی سے پہلے تھے +

باپ جیسا کہ اسکے کلام سے معلوم ہوتا ہے ایک باحد اور متوجع آدمی تھا شیخ کے بچپن کا حال اس سے زیادہ معلوم نہیں کرتا درودے کے مسائل اُس کو بہت تھوڑی عمر میں یاد کرائے گئے تھے اور بچپن ہی میں اُس کو عبادت۔ شب بیداری۔ اور تلاوتِ قرآن عہدِ کمالِ شوق تھا۔ عید اور جمواروں میں ہمیشہ باپ کے ہمراہ رہتا تھا۔ اور کہیں آواز پھرنے نہ پاتا تھا۔ باپ اُس کے افعال و اقوال کی نگہ رانی عام باپوں کی نسبت بہت زیادہ کرتا تھا۔ اور بے موقع بولنے پر زبرد تو بیج کرتا تھا۔ شیخ نے اپنی تربیت کا بڑا سبب اسی باپ کی تادیب اور زبرد تو بیج کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ وہ ہر سال میں کہتا ہے

ندانہ کہ سعدی مکاں از چہ یافت نہ ہانوں کوشت و نہ دریا شکافت

بچہ دی بخورد از بزہ لگاں فقا خدا دادش اندر بزرگی صفا

لیکن شیخ کے بعض اشارے ثابت ہوتا ہے کہ باپ اُس کو کہن چھوڑ کر گیا تھا۔ باپ کی وفات کے بعد غالباً شیخ کی والدہ نے اُس کو تربیت کیا ہو گا۔ کیونکہ اُس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ جوانی کی حالت میں اُس کی ماں زندہ تھی۔ کئی تذکروں میں یہ لکھا ہے کہ علامہ قطب الدین شیرازی جو کہ محققِ علوم سی کشاگرہ شیخ۔ اور بڑا کونال کا مصاحب خاص تھا۔ شیخ کا، سوں یا قریب کا رشتہ دار تھا۔ مگر بعض تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شیخ اور علامہ کے باہم ایسی بے شکافتہ ہنسی اور جیل ہوئی تھی۔ جو ماموں بھائیوں میں نازیبا معلوم ہوتی ہے۔ بہر حال شیخ اور علامہ دونوں ہم عمر تھے اور شاید کچھ قرابت بھی رکھتے ہوں۔

شیخ کی تعلیم کا حال

اگرچہ شیخ کا باپ ایک درویش مزاج آدمی تھا اور بچپن میں شیخ کو بہ نسبت علم حاصل کرنے کے زہد و عبادت اور صلاح و تقویٰ کی زیادہ ترغیب دی گئی تھی۔ ایک سو اسی سال ابھی جوان نہ ہونے پایا تھا کہ باپ کا انتقال ہو گیا۔ مگر اس نے ہر ش سنبھالتے ہی خیر ازاد اور اسکے قرب و جوار میں علماء و مشائخ اور فصحاء و بلغاء کی ایک جماعت کثیر اپنی آنکھ سے دیکھی تھی۔ اور ان سے بھی زیادہ ایک جم غفیر کا شہرہ و خطہ فارس میں اہل کمال ہو گزرے تھے۔ بزرگوں سے سنا تھا۔ قاعدہ ہے کہ بزرگوں اور کابلوں کے دیکھنے یا آن کی شہرت اور ذکر خیر سنتے سے ہر ہمارے لوگوں کے دل میں خود بخود ان کی پس اور پیروی کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے تحصیل علم کا شوق اس کو دائمگیر ہوا۔ اگرچہ دارالعلم شیراز میں تحصیل علم کا سامان مہیا تھا۔ علمائے جلیل اقدار درس و تدریس میں مشغول تھے۔ مدرسہ عصفیہ جو کہ عصفیہ الدولہ دہلی نے قائم کیا تھا اور اس کے سوا اور مدرسے وہاں موجود تھے لیکن اس وقت وہاں ایسی اہل تہذیب اور خرابی پھیلی ہوئی تھی کہ اہل شیراز کو ایک دم اطمینان نصیب نہ تھا۔ اگرچہ اتابک سعد بن زنگی نہایت عادل۔ رحمہ دل۔ بامروت اور فیاض بادشاہ تھا مگر اس کی طبیعت میں اولوالعزمی حد سے زیادہ تھی۔ اکثر خیراد کو خالی چھوڑ کر عراق کے حدود میں لشکر کشی کرتا رہتا تھا۔ اور اپنی تمہات کے شوق میں مالک محروسہ کو بالکل فراموش کر دیتا تھا۔ اسکی طبیعت کے دمانے میں اکثر مفسد لوگ میدان خالی پا کر اطراف و جوارب سے شیراز پر چڑھ آتے تھے۔ اور محل و غارت کر کے چلے جاتے تھے۔ چنانچہ ساتویں صدی کے آغاز میں اول اتابک اوزبک پہلوان نے اور پھر چند روز بعد سلطان

عناث الدین نے بہت سے لشکر کے ساتھ اگر شیراز کو ایسا آخت و تاراج کیا کہ اُس کی تباہی اور بربادی میں کوئی دقیقہ باقی نہ رہا۔ ایسی حالت میں تحصیل علم کی فرصت شیخ کو وطن میں ملنی دشوار بلکہ ناممکن تھی۔ اس کے علاوہ امن کے زمانے میں بھی وطن کے مکروہات اور موانع ہمیشہ تحصیل علم میں خنڈا ہوتے ہیں یہ اسباب تھے جنہوں نے شیخ کو ترک وطن پر مجبور کیا۔ چنانچہ ذیل کے اشار میں اُس نے شیراز سے تنگ آکر بغداد جانے کا ذکر کیا ہے

دل از صحبت شیراز پر کلی گرفت وقت آنست کہ پرسی نہر از بغداد
سعدی با حُب وطن گریہ حدیث صحیح نواں مرد بہ سختی کہ سن اینجا زادم
توجہ میرادل شیراز کی صحبت سے تنگ آگیا۔ اب وہ وقت ہے کہ مجھ سے بغداد کا حال پوچھو۔ اے سعدی وطن کی محبت اگرچہ صحیح بات ہے۔ مگر اس ضرورت سے کہ میں یہاں پیدا ہوا ہوں سختی میں مرا نہیں جاتا۔

اس زمانے میں مسلمانوں کے بے شمار درسے بلاد اسلام میں جایا کھلے ہوئے تھے جہاں دور دور سے طالب علم آکر علم تحصیل کرتے تھے۔ ہرات۔ نیشاپور۔ اصفہان۔ بصرہ۔ اور بغداد میں خواجہ نظام الملک طوسی وزیر الپ ارسلان کے بنائے ہوئے مدرسے آباد اور سمورے تھے ان کے سوا شام عراق

سے لے کر مصر کے مدرسے نامور تھے ملک الانار صلیح الدین کا بنایا ہوا قبرس میں دور در دور مدرسہ رواج
رواح کے پورے تھے ذی ابوالقاسم حبیب اللہ کا۔ اور مدرسہ بہت الشام خاقان بیت ابوبکر صلیح الدین
کے اور مدرسہ شمس الملک عادل بیت ابوبکر کا دمشق میں۔ اور مدرسہ غریبہ خلیفہ مستنصر عہد کا بغداد میں۔ اور
مدرسہ حویری الدین کا قاہرہ میں۔ اور نوریت خورادین ارسلان شاہ صاحب مہمل کا مہمل میں بیت شمس
ان کے سوا جیساکہ تاریخ ابن خلدون سے معلوم ہوگا ہے اور بت سے مدرسے جیسا کہ مدرسہ تفتیشیہ تیار
اور تیسویہ تیسویہ۔ لغویہ۔ غریبہ وغیرہ بیت مقدس۔ مہمل۔ بغداد میں اور اسکندریہ وغیرہ بیت مقدس۔

اور مصر وغیرہ جگہ جگہ مدرسے جاری تھے۔ لیکن سب سے زیادہ شہرت نظامیہ طبریہ نے حاصل کی تھی جس کو خواجہ نظام الملک طوسی نے ۷۵۷ ہجری میں بنوایا تھا۔ ہزاروں جلیل القدر عالم اور حکیم اس مدرسے سے تعلیم پا کر نکلے ہیں جن کی تصنیفات اب تک مسلمانوں میں موجود ہیں۔ یہ مدرسہ اس قدر نامور تھا کہ جو علما یہاں کے پڑھے ہوئے مشہور ہو جاتے تھے پھر ان کے مستند اور ذی اعتبار ہونے میں کسی کو شبہ نہ رہتا تھا۔ امام ابو حامد غزالی۔ شیخ عراق عبدالقادر شہروردی۔ استاد الائمہ ابو حامد عواد الدین موصلی اور اوربے بڑے جلیل القدر عالموں نے اسی مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔ شیخ کو اس مدرسے میں آنے کی ترغیب اس سبب سے اور بھی زیادہ ہوئی ہوئی کہ اس کا ہوملن شیخ ابواسحاق شیرازی جس کا علم و فضل شہرہ آفاق تھا مدت تک اس مدرسے کا متولی رہا تھا۔ جس وقت نظام الملک نے بغداد میں مدرسہ قائم کیا تھا تو سب سے اول یہاں کا متولی شیخ ابواسحاق کو مقرر کیا تھا۔ اور اسی سبب سے اہل شیراز کو اس مدرسے سے ایک خاص نسبت اور لگاؤ تھا۔

الغرض شیخ نے مدرسہ نظامیہ میں جاکر تحصیل علم شروع کی اور جیسا کہ ہوتاں میں اُس نے تصریح کی ہے وہاں سے اُس کے لیے کچھ دینی کتب بھی مقرر ہو گیا تھا۔ بغداد میں مین لوگوں سے شیخ نے پڑھا تھا ان میں سب سے زیادہ شہرہ اور نامور علامہ ابو الفرج عبدالرحمن ابن جوزی ہے جس کا لقب جمال الدین ہے یہ شخص حدیث اور تفسیر میں اپنے وقت کا امام تھا۔ بے شمار کتابیں اس کی تصنیفات سے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اُس نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میں نے جن تلوں سے

حدیث علمی ہے اُن کا تراشہ میرے تجربے میں ہے سونے کے بعد مجھ کو ہٹائیں۔
تو غسل کے لیے اُس تراشے سے پانی گرم کریں۔ چنانچہ اُس کی وصیت کے
سوا فتح علی کیا گیا۔ اور پانی گرم ہو کر کچھ تراشہ بچ رہا +

جس زمانے میں شیخ بغداد میں علامہ ابن جوزی سے پڑھتا تھا۔ اُس وقت
شیخ کی جوانی کا آغاز تھا۔ دولت شاہ سمرقندی و سرگوداسلی نے لکھا ہے کہ
ابن جوزی سے تحصیل علم کرنے کے بعد شیخ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ
سے بیعت کی تھی اور اُن سے علمِ تصوف اور طریقِ معرفت و سلوک حاصل کیا۔
اور پہلی مرتبہ انھیں کے ساتھ بیت اللہ کی حج کو گیا۔ مگر بات بالکل غلط ہے
کیونکہ شیخ سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کی وفات ثلاثہ ہجری بمطابق شیخ
سعدی کی ولادت سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ شیخ
مشاب الدین سمرودی سے اُس کو صحبت رہی ہے۔ اور ایک بار سفردریا
میں وہ اُن کے ساتھ رہا ہے۔

شیخ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ طالبِ علمی کے زمانے میں اُس کے ہنرمند
اور مہسر لوگ اُس کی خوش بیانی اور حسنِ تقریر پر رشک کرتے تھے۔ چنانچہ
ایک بار اُس نے اُس سے شکایت کی کہ ظالم طالب علم مجھ کو رشک کی نگاہ
سے دیکھتا ہے۔ جب میں آپس میں بیٹھ کر مسائلِ علمیہ بیان کرتا ہوں تو وہ
سے جل جاتا ہے۔ اُس نے دیکھ کر شیخ پر غصہ ہوا اور کہا کہ اوروں کے رشک و حسد
کی تو شکایت کرتے ہو اور اپنی بدگوئی اور غیبت کو برا نہیں سمجھتے۔ تم دونوں اپنی
عاقبت خراب کرتے ہو۔ وہ رشک و حسد سے اور تم بدگوئی و غیبت سے +

شیخ کو بچپن سے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے فقر اور درویشی کی طرف زیادہ میلان تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی وہ برابر و سماع کی مجلسوں میں شریک ہوتا تھا۔ اور علامہ ابو الفرج ابن جوزی ہمیشہ اُس کو سماع سے منع کرتا تھا۔ مگر شیخ کو سماع کا ایسا شغف کا تھا۔ کہ اس باب میں کسی کی نصیحت کا گرنہ ہوتی تھی۔ لیکن علما کی ہوساٹی آہستہ آہستہ اُس کے دل میں گھر کرتی جاتی تھی۔ آخر ایک روز کسی مجلس میں اُس کو ایک بد آوازِ خوال سے پالا پڑا اور بضرورت ساری رات اُس کو وہ صحبت میں بسر ہوئی۔ صحبت کے ختم ہونے پر آپ نے سر سے منڈا سا اتارا اور حیب میں سے ایک دینار نکالا اور یہ دونوں چیزیں خوال کی نذر کیں۔ اصحاب مجلس کو اس حرکت سے تعجب ہوا۔ شیخ نے یاروں سے کہا کہ میں نے آج اس شخص کی کراست مشاہد کی ہے۔ میرا مرقی استاد ہمیشہ سماع سے منع کرتا تھا۔ مگر میں نے اُس کے حکم کی تعمیل نہ کی اور برابر سماع میں شریک ہوتا رہا۔ آج خوش قسمتی سے اس مبارک جلسے میں آنا ہوا اور اس بزرگوار خوال کے تصرف سے میں نے ہمیشہ کے لیے سماع سے توبہ کی۔

شیخ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ مدرسے کی صحبت سے عالم طالب علمی میں تصوف اور درویشی کے خیالات اُس کے دل سے اتر گئے تھے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک شخص خانقاہ کو چھوڑ کر مدرسے میں چلا آیا۔ میں نے پوچھا کہ عالم اور دہلیز میں کیا فرق دیکھا جو اس طریقے کو چھوڑ کر اس کو پچے میں قدم رکھا۔ کہا اور دہلیز حیرت اپنی جان بچانے میں کوشش کرتے ہیں اور علماء چاہتے ہیں کہ اپنے ساتھ ڈوبتوں کو بھی بچائیں۔

شیخ نے شہسواروں کی خبر بات جانی ہے کہ اس کو کسی سرزمین کے ساتھ عراق باغداد سے بڑھ کر تعلق نہیں رہا چنانچہ ایک جگہ لکھا ہے ۵

بعد ادعای جائے خوش بنایم چو آید ساقی زن زائے زان پوہ عراقی

جس زمانے میں شیخ نظامیہ بغداد میں پڑھتا تھا اگرچہ اس وقت حقیقت میں عباسیوں کی خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مگر ظاہری شان و شوکت ہمدون اور مامون کے عہد کو یاد دلاتی تھی۔ عباسیہ کا اخیر خلیفہ مستطیم باغداد میں سلطنت پر محکم تھا۔ اور اس کے عہد میں گویا بغداد کی خلافت نے چند روز کے لیے سنبھال لیا تھا۔ اطراف عالم کے اکابر و اشراف اور ہر علم و فن کے ماہر اور رابر باب حفت و صنعت مدینۃ السلام بغداد میں جمع تھے عیش و عشرت کے سامان کچھ زیادہ ہر طرف حیات و ترقی تھے۔ خلیفہ کی عظمت اور رعب و ادب سے بڑے بڑے جلیل القدر بادشاہ لڑتے تھے اور چوبیس بڑے شہر تھے اور زراعت و باغبانہ کثرت میں مشکل سے باریاب ہوتے تھے۔ فقیر خلافت کے آستانے پر ایک پتھر پر منزلۂ جمالاسید کے پڑا ہوا تھا۔ جس کو امراء و اعیان سلطنت فقیر خلافت میں داخل ہوتے وقت بوسہ دیتے تھے۔ ہزاروں میں جس راہ سے خلیفہ کی سواری نکلتی تھی وہاں ایک مورت چیلے سے رستے کے تمام منظر اور بالاعانے کرایہ داروں سے ڈک جاتے تھے ۶

انقرض عباسیہ کا یہ آخری جاہ و جلال شیخ نے اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور پھر اسی آنکھ سے اس وارا الحلافہ کا بے چراغ ہونا بھی سیکھتا ہے اور گاہ ملک و سلاطین رہا تھا اور اس خاندان کی بددعا ہی جس کا سایہ اقتدار پر رہا

ایشیا۔ اور افریقہ پر برابر پڑا تھا اور خلیفہ اور اس کی اولاد اور ہزار ہا بنی عباس اور کئی لاکھ اہل لشکر اور اہل بغداد کا تار یوں کی تیج بے دریغ سے متصل ہوا اور عرب کے سطوت اور اقتدار کا ہمیشہ کے لیے صفحہ روزگار سے مٹ جانا مشاہدہ کیا تھا۔ شیخ نے وہ تمام اسباب بھی دیکھے تھے جو مستقیم ہاشم کی تباہی اور عباسیہ کے زوال کا باعث ہوئے اور وہ ظلم و ستم بھی اس کی انگلیوں کے زور و گزروں سے تھے جو بلا کو خاں کے خونخوار لشکر نے بغداد میں برپا کیے ان حوادث و واقعات کا تماشا شیخ کے لیے ایک نہایت عمدہ سبق تھا۔ جس نے اس کے دل میں قوم کی دلسوزی۔ بادشاہی کی اصلاح۔ رعایا کی ہمدردی۔ اور طریقہ کے لوگوں کی بھلائی کا خیال پیدا کر دیا تھا۔ اور یہی خیال کی بدولت اس نے اپنی تمام عمر انا سے جنس کی نصیحت اور خیر اندیشی میں صرف کی۔

مستقیم ہاشم کا نہایت دردناک مرتبہ شیخ نے اس وقت لکھا ہے جب کوئی شخص اس کا رونا دہانا اور خواہش سلام کے ہوا کوئی اس کا ماتم دار اور گواہ و شہس باقی نہ تھا۔ اس مرتبے کے چند بیات اس مرتبے پر نقل کرنے سے مستقیم ہونے میں۔ انبیات

ترجمہ

اشعار

۱۔ آسمان راجت بود گر غوں یار و نہیز آسمان کا فرض ہے کہ مستقیم کی تباہی
 یزد و ال ملک مستقیم امیر المومنین یزدین پر خون برسانے۔
 لے محمد گریہ است سے بداری منہ خاک لے محمد مصطفیٰ اگر آپ قیامت ہی کو قدر
 سر بر آوریں قیامت حد میان خلق میں سے باہر نکلیں گے تو ابھی نکل کر قیامت قیما

میں دیکھ لیجیے +

محل کے اوپر دروں کے صلق کا خون
ڈیوڑھی سے بہ گیا اور ہمارے دل کا خون
آستین سے ٹپک نکلا +

زمانے کی گردن اور دنیا کے انقلاب
پتا و مانگنی چاہیے بات کسی کے خیال
میں بھی نہ آتی تھی کہ توں سے یوں ہو جائیگا +
جنھوں نے اُس بیت المحرم کی شان و شوکت
دیکھی ہے جہاں روم کے قیصر اور چین کے
خاقان خاک پر سر گر گئے اور زمین پر بیٹھے تھے
وہ ذرا آنکھ اٹھا کر دیکھیں +

کہ پیغمبر خدا کے بنی عم کا خون اُس خاک
پر گیا جہاں سلاطین ماتھا گر گئے تھے +
آئندہ دنیا سے آرام کی توقع رکھنی نہیں
چاہیے کیونکہ انگوٹھی پر سے جب نیکیں جاتا رہتا
ہے تو بڑی کلوش رہ جاتی ہے +

دجلے کا پانی بہتر لہو ہو گیا ہے اگر آبِ حار
رہیگا تو تختستانِ بلی کی خاک کو خون
سے رنگین کر دیجگا +

۴۔ نازنینانِ خرم را خونِ طوقِ نہیں
نآساں بگدشت مارا نوں لہ نہ نہیں

۴۔ دینار از دور گیتی و انقلابِ نہ کار
در خیال کن گشتے کا چنناں گردِ حباب

۵۔ دیدہ ہر دار لے کر دیدی شوکتِ بیتِ محرم
قیصرانِ روم سر بر خاکِ خاقانِ زرب

۶۔ خونِ فرزندانِ عمِ مصطفیٰ شدِ محرم
ہم پر اس خاک کے کہ سلطانانِ سافینہ ہیں

۷۔ بعد از اس سائنس انوینا بنا ہوا چشمِ دوا
تیمور و شہسوی ماند چو بر نیزہ دیکھیں

۸۔ و جلا غمناست زیں پس گم نہ درویش
خاکِ گلستانِ بلحا را کند باخود عجیب

۹۔ نوحہ لائق نیست بظالم شہیدان و مکتوبت
کترین دولت مرایشان ابھشت ترین
شہیدوں کی خاک پر نوحہ کی کیا ضرورت
کیونکہ ان کے لیے اوتنے نعمت فردوس
بریں ہے +

۱۰۔ لیکن اپنے رُویے مسلانی و راہِ حیرت
مہرباں را دل بسوزد و رفاقی نازیں
ہاں مگر رحم اور اسلام کی ہمدی کے سبب
کادل دوست کی جدائی میں کڑھتا ہے +
۱۱۔ باقی تا فردا کہ بینی روزِ داد و ستغینز
کز لحد باروے خوں آلودہ بر خیزد و گویں
کل تک صبر و قیامت کے دن یکدینا کہ قبر
سے اہل قبر نو بھرا منہ لیکر اٹھنے +
۱۲۔ تکیہ بزدلیا نہ بایہ کرد و دل برے نہ
کاسماں گاہے بہرست لے برادر گویں
یارو دنیا پر بھروسہ کرنا اور اس سے مل
لگانا نہیں چاہیے کیونکہ آسمان کھسی دو
ہے اور کھسی دشمن +

۱۳۔ زور بازوئے شجاعت بر نیاید باہل
چوں قضا آید نمازِ موت لے لے زبیں
شجاعت کا زور موت پر غالب نہیں آسکتا
اور جب قضا آتی ہے تو اسے صاحب
کی قوت جاتی رہتی ہے +

۱۴۔ تیغِ ہندی بر نیاید روزِ عیا از نیام
شیر مزے را کہ باشد مرگِ تیراں لیں
تجنہا و در کی گھات میں اجل جوتی ہے حق
کی اسیل تلوار لڑائی کے دن میان سے
باہر نہیں نکلتی ہے +

۱۵۔ تجربت بیخاندہ است آنرا کہ برگزیدخت
حلاوت دن چہ سواں را کہ برگزید زین
جب نصیبہ لپٹ گیا پھر اس کا امتحان کرنا
بے فائدہ ہے اور جب زین الٹ گیا تو
بھر حملہ کرنا فضول ہے +

۱۶۔ کرگستاہ اپنے مہوار دنیا جنگجو یار و مہوار دنیا کے لیے گد آپس میں لڑ رہے
 اے برادرِ غرور مندی چوسین غافل ہیں اگر تم عقل مند ہو تو سرخوں کی طرح
 الگ بیٹھو +

شیخ پر بعض امامیہ نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مستعصم باللہ جیسے بالائقی اور شذنی
 خلیفہ کا مرتبہ لکھنا شیخ کی شان سے نہایت بعید تھا۔ اگرچہ اس بات کا انکار نہیں
 ہو سکتا کہ مستعصم باللہ میں دانائی نیکی اور انصاف نہ تھا۔ مکبر اور غرور نے اس کے
 مانع کو مختل کر دیا تھا۔ غفلت اور بے پروائی کی قوت یہاں تک پہنچی تھی کہ ایک بار
 اس کے بیٹے ابو یوسف نے اہل سنت کی حمایت اور طرفداری میں کنج کے بنی ہاشم پر
 نہایت سخت ظلم اور تعدی کی جس کے بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں
 مگر اس بالائقی خلیفہ نے اس کا کچھ تدارک نہ کیا۔ لیکن اس سے شیخ کے مرتبہ لکھنے
 پر کچھ اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مستعصم باللہ کو کیسا ہی بالائقی اور قابلِ نفیر سمجھو
 مگر یہ ضرور مانتا پڑے گا کہ اس کے بگڑنے سے نہ صرف بنی عباس کی حکومت دنیا سے
 اٹھ گئی بلکہ مشرق سے مغرب تک جہاں جہاں عرب کے قدم جمے ہوئے تھے۔
 ایک بارگی ان میں تزلزل آگیا۔ اور چند روز میں ان کا اقتدار صفحہ ہستی سے
 یک قلم محو ہو گیا۔ پس جس شخص کے رگ و پے میں عرب کے خون کا ایک قطرہ بھی
 چلا ہوا تھا یا جس کے دل میں ایک ذرہ برا سلام کی حیثیت تھی۔ اس کے لیے
 اس سے بڑھ کر اور کیا مصیبت ہو سکتی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
 کے بنی عم کا خون تاناری وحشیوں کے ہاتھ سے آبدِ باریاں کی طرح بنایا گیا۔
 جس عمارت کی بنیاد خلفائے راشدین کے ہنرمند ہاتھوں نے ڈالی تھی وہ

چشمِ زدن میں ایک خاک کا ڈھیر ہو گیا۔ شیخ نے حقیقت میں مستعصم باللہ کا
مرثیہ نہیں لکھا بلکہ اسلام کا مرثیہ لکھا ہے۔ اور اگر اس موقع پر حسان ابن ثابت
موجود ہوتے تو ان کو بھی ایسا ہی مرثیہ لکھنا پڑتا۔ مستعصم کے حال پر یہ شعر
صاوق آتا ہے ۵

ہمارے بعد بہت زوئے ہم کو اہلِ وفا کا بچے مٹنے سے مہر و وفا کا نام
القصہ شیخ مدرّسہ نظامیہ سے نکل کر نڈتِ دراد تک ایشیا اور افریقہ میں برابر
سیر و سیاحت کرتا رہا۔ جب کتاب کے مطالعہ سے جی سیر ہو گیا تو نسخہ کائنات
کا مطالعہ شروع کیا۔ بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ اُس نے تین برس کی عمر
تک تحصیلِ علم کی ہے اور تین برس سیر و سفر میں اور تین برس تصنیف و
تالیف میں اور تین برس عزالتِ نشینی میں بسر کیے ہیں۔ اگرچہ یہ تین تین
برس چار مصادی جتنے مقرر کرنے تکلف سے خالی نہیں۔ اور غالباً یہ مضمون
منو شاستر سے اخذ کیا گیا ہے جس میں عمر کو ایسے ایسے تین یا چار حصّوں پر
تقسیم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ شیخ کی عمر کا بڑا حصّہ
تحصیلِ علم اور سیر و سفر میں بسر ہوا۔ نعماتِ الاض میں لکھا ہے کہ شیخ
عالمِ صوفیوں میں سے تھا اور علوم و آداب سے بہرہ کامل رکھتا تھا۔ اگرچہ
اُس کی شہرت طبقہِ علما میں اس قدر نہیں ہوئی جس قدر زمرہٴ شعرا میں ہوئی
مگر اِس کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک محقق اور سلجھا ہوا عالم تھا
بعض موقعوں پر فہما اور فصاحت کے مجموعوں میں اُس کو بحث و مناظرہ کا لائق
مناظر سمجھا جاتا ہے۔ اور اخیر کو اُس کی رائے سب پر غالب رہی ہے۔ ایک بار غالباً شام

یاعراق کے کسی شہر میں جہاں اُس کے ہاں سچان کم تھے کسی تقریب سے
 قاضی شہر کی مجلس میں اُس کا گز رہوا۔ اُس وقت شیخ نہایت خشکے مال
 تھا اور مجلس میں تمام علما و فقہا کمال تزک و احتشام سے بیٹھے تھے شیخ ساہلی
 سے سب کے برابر جا بیٹھا۔ خدام نے جھٹک کر وہاں سے اٹھا دیا۔ اور شکل
 سے پائین مجلس جگہ ملی۔ اُس وقت کسی مسئلے میں گفتگو ہو رہی تھی اور کسی
 سے وہ عقدہ حل نہ ہوتا تھا۔ شیخ نے دُور ہی سے آواز بلند کیا کہ اگر مجھ کو اجازت
 ہو تو اس باب میں میں بھی کچھ کہوں۔ سب شیخ کی طرف متوجہ ہو گئے اور ایک
 کم حیثیت آدمی کی ایسی جرأت پر سب کو تعجب ہوا۔ شیخ نے اس مسئلے کو
 بہت خوبی اور فصاحت سے بیان کیا۔ چاروں طرف سے تمہین و آفرین
 ہونے لگی۔ قاضی نے منہ چھوڑ دی اور عامہ سے تائید کر شیخ کے سامنے رکھ دیا۔
 شیخ نے کہا یہ غرور کا اوزار بھی نہیں چاہیے۔ جب لوگ محکمہ حقیقہ اور ذلیل
 معلوم ہونگے تو پیٹھے پرانے کپڑے والوں سے میں بھی تمھاری طرح ناک چڑھاؤں گا۔
 اسی طرح اور بہت سے طعن اور ملامت کے الفاظ کہہ کر وہاں سے چل دیا۔ شیخ
 نے یہ اپنی سرگذشت بوستاں میں اس طرح بیان کی ہے کہ گویا کسی غیر کی
 سرگذشت ہے مگر اخیر کے شعر سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے خاص
 اپنی زوداد لکھی ہے۔

شیخ کی تحصیل اور مبلغ علم کا حال دریافت ہونا مشکل ہے۔ مگر ظاہر یہ
 معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے فلسفہ اور حکمت کی طرف بہت کم توجہ کی تھی۔ زیادہ تر
 احکامی و نبیاتی اور علم سلوک و علم ادب کی جانب مضمون رہی اور خاص کر

و عطا اور خطابت میں جس کی تعلیم مدرسہ نظامیہ میں باقاعدہ طور سے ہوتی تھی اس کو عمدہ دستگاہ تھی۔ طالب علمی ہی کے زمانے میں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے اس کے ہم چاہت لوگ اس کی خوش بیانی پر رشک کرتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلا و شام میں اس نے نعتوں و عطا کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ میں ایک دفعہ جامع بعلبک میں عطا کر رہا تھا اور اہل مجلس نہایت افسوسہ دل کئے جن کو کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ میں اس آیت کے معنی بیان کر رہا تھا کہ وَتَحْنُ أَقْرَبَ إِلَيْنِهِ مِنْ جَنَلِ الْأَوَّامِ لَمَّا کہ ایک راہرو وہاں سے گزرا۔ اس نے یہاں سن کر ایسا پر جوش نعرہ مارا کہ اُوں لوگ بھی اس کے ساتھ چیت گئے اور تمام مجلس گرم ہو گئی۔ فہج کو علاوہ علم و فضل کے اکثر زبانوں سے واقفیت تھی۔ عرب۔ شام اور مصر وغیرہ میں رہتے رہتے وہاں کی زبان گویا اس کی مادری زبان ہو گئی تھی۔ عطا اور محبت و مباحثہ اور تمام معاملات عربی زبان میں کرتا تھا۔ اور صرف روزمرہ کی بول چال ہی پر قدرت نہ تھی۔ بلکہ عربی قصائد فصیح اور بامزہ اس کے کلیات میں موجود ہیں۔ اس کے سوائے خاندانہ سو منات کے قصہ میں اس نے ایک جگہ ظاہر کیا ہے کہ وہ غزنی کی زبان جانتا تھا۔ سرگورادسلی لکھتے ہیں کہ ایشیا ترک جنرل کے ایک پرچہ مطبوعہ ۱۳۱۵ء میں فرانس کے مشہور محقق ام گارسن ڈی نیسی نے لکھا ہے کہ ”سعدی پہا شخص ہے جس نے ہندوستانی زبان یعنی دھینے میں جب کہ ۱۰ سو منات اور گجرات میں آیا تھا شعر کہا ہے“ مگر یہ ایک منظر ہے جو نہ صرف محقق مذکور کو بلکہ اس سے پہلے ہندوستان کے تذکرہ نویسوں کو بھی ہوا ہے۔ اصل یہ ہے کہ دکن میں بھی ایک شاعر سوری تخلص اس زمانے میں ہوا ہے۔

جب کہ ریحۃ کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی تھی۔ یہ خیال کیا گیا ہے کہ اُس کی وفات کو تقریباً چار ہزار برس گزرے ہیں کہتے ہیں کہ ریحۃ میں سب سے پہلے اُس نے شعر کہا ہے۔ اور یہ تین شعر اُس کے مشہور ہیں۔ اشعار

قشقہ چو دیدم بر رخسار غم کہ یہ کیا دیتے، گفتا کہ دُرے بادے اس ملک کی یہ بیت،
ہمنا سخن کو دل دیا۔ تم دل لیا اور دکھ دیا، ہم یہ کیا۔ تم وہ کیا ایسی بھلی یہ بیت،
سعدی بگفتا ریحۃ در ریحۃ دُر ریحۃ، شیر و شکر آہستہ ہم ریحۃ ہم گیت،
مرزا رفیع سودا نے اپنے تذکرے میں ان اشعار کو شیخ سعدی شیرازی کے ہم
پر لکھا ہے مگر حکیم قدرت اللہ خاں قاسم نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ اس شخص
کو سعدی شیرازی کہنا جیسا کہ بعض تذکرہ نویسوں نے دھوکا کھایا ہے محض غلط ہے۔
سرگورادسلی نے یہ بھی لکھا ہے کہ شیخ کی ایک نظم دیکھی گئی ہے جس میں اُس نے
اسٹارہ مختلف زبانیں اُن ملکوں کی لکھی ہیں جہاں جہاں وہ سیاحی کو گیا ہے
اس بیان میں بھی ظاہر کچھ مبہمانہ نہیں معلوم ہوتا۔ کیونکہ ایک مڈت دراز
تک وہ ایشیا اور افریقہ کے مختلف ملکوں میں سفر کرتا رہا ہے اور اکثر جگہ اُس نے
بہت بہت دیر تک قیام کیا۔ شام۔ عراق۔ فلسطین۔ مصر۔ یمن اور ہندوستان
میں مڈت دراز تک مقام کرنا خود اُس کے کلام سے ثابت ہوتا ہے پس ضرور کچھ
کہ وہ ان ملکوں کی زبان سے کافی واقفیت رکھتا ہو۔ اس کے سوا اُس نے
اور بہت سے ملکوں کی سیر کی ہے جس میں اکثر کا ذکر گلستاں اور بوستاں میں کیا

شیخ کی سیاحت کا حال

حرگوروسلی لکھتے ہیں کہ مشرقی سیاحوں میں ابن بطوطا کے سوا شیخ سعدی سے بڑھکر اور کوئی سیاح ہم نے نہیں سنا۔ اُس نے ایشیائے کوچک۔ بربر۔ حبش۔ مصر۔ شام۔ فلسطین۔ آرمینیا۔ عرب۔ جملہ مالک ایران۔ اکثر مالک توران۔ ہندوستان۔ رودبار۔ ولیم۔ کاشغر اور جیوں سے آگے تک اور بصرہ و بغداد سے ستھین وال تک کی سیر کی تھی۔ صاحب موصوف یہ بھی لکھتے ہیں کہ شیخ کو چار دفعہ ہندوستان میں آنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اناں جملہ ایک دفعہ چٹان غلش کے وقت میں اور دو دفعہ خاص امیر خسرو سے ملنے کو دہلی میں آیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ مضمون محض بے سرو پا ہے۔ غلش کوئی بادشاہ ہندوستان میں نہیں ہوا۔ شاید سلطان التمش کے دھوکے میں غلش لکھا گیا ہے۔

بیشک شیخ نے غلش کا ذکر گلستاں میں ایک جگہ کیا ہے۔ جہاں یہ لکھا ہے کہ "سرہنگ را در رابر در سراے غلش دیدم" مگر ہندوستان میں کوئی غلش یا سراے غلش نہیں مٹی گئی۔ سعدی اور امیر خسرو کی ملاقات بھی ثابت نہیں ہوتی۔ اگرچہ اکثر تذکرہ نویسوں کو یہ شبہ ہوا ہے۔ شیخ آذری نے بھی اپنی کتاب جوامع الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ امیر کے دیکھنے کو شیراز سے ہندوستان میں آیا ہے۔ مگر اس کا ثبوت کچھ نہیں ہے۔ بلکہ شیخ اور امیر خسرو کے عصر کا تقابل کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کا امیر کے ملنے کے لیے آنا خلاف قیاس ہے۔ خسرو کی ولادت سلفہ جری میں ہوئی ہے۔ جب کہ شیخ کی عمر ستر برس سے زیادہ

لے ستمیں وال سے مراد شاید سکندری ہے۔ کیونکہ شیخ نے ایک جگہ اپنے دیوان میں بھیج کی ہے کہ میں
سکندری تک گیا ہوں۔

ہو چکی تھی۔ اب اگر امیر خسرو کی شہرت بمرض محال کہیں برس کی عمر میں ایران تک پہنچ گئی تھی۔ تو اس وقت شیخ کی عمر تقریباً سو برس کی ہونی چاہیے۔ پس یہ کونکر خیال میں آتا ہے کہ ایک سو برس کا شیخ جو شاعری میں یکایک وقت اور مقبول طالع و عام ہوا، ایک کچھ برس کے لڑکے کی شہرت منکر ایران سے ہندوستان میں آئے البتہ معجزہ اول سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ سلطان غیاث الدین بلبن کے بیٹے قان محمد سلطان ناظم مکتان نے جس کو خان شہید کہتے ہیں۔ شیخ سے دو بار ملاؤ کی کہ آپ شیراز سے یہاں آئیے۔ اور چونکہ امیر خسرو اس وقت محمد سلطان کے مصاحبوں میں تھے۔ اس لیے اُن کا کلام بھی شیخ کے ملاحظے کے لیے سمجھا۔ شیخ اُس وقت بہت مہتر ہو گیا تھا اس سبب سے خود آسکا۔ لیکن دونوں دفعہ اپنے دو دیوان اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے خان شہید کو بھیجے اور امیر خسرو کی نسبت یہ لکھا کہ اس جو بہر قابل کی تربیت اور قدر افزائی کرنی چاہیے +

شیخ کا ہندوستان میں چار دفعہ آنا بھی ثابت نہیں ہے۔ صرف ہوتا ہے کہ آنا معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے ٹومنات سے مل کر ایک بار مغربی ہندوستان کا دور کیا ہے اور وہاں سے بحر ہند اور بحر عرب کی راہ یمن اور حجاز میں پہنچا ہے + شیخ کے سفر جس قدر گلستاں اور بوستاں سے ثابت ہوئے ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے کہ مشرق میں خراسان ترکستان اور تاتار تک گیا ہے اور پنج و کاشغر وغیرہ میں مقیم رہا ہے۔ جنوب میں ٹومنات تک آیا اور ایک مدت تک یہاں ٹھہرا۔ اور ٹومنات سے مغربی ہندوستان میں پہر کرد یا کی راہ سے عرب کو چلا آیا تھا اور مغرب کی طرف عراق عجم۔ آذربایجان۔ عراق عرب۔ شام۔ فلسطین۔ اور

ایشیائے کوچک میں بارہائیں کا گزر ہوا ہے۔ مہمناں۔ تبریز۔ لہرہ۔ کوفہ۔ واسط
 بیت المقدس۔ طرابلس الشرق۔ دمشق۔ دیار کیر۔ اور اقصائے روم کے شمال
 اور قریوں میں مدت و ساز تک اس کی آمد و رفت رہی۔ بے مغرب کی جانب
 عرب اور افریقہ میں اُس کا بار بار جانا اور وہاں بظہیر نامعلوم ہوتا ہے ہندوستان کے
 مراجعت کے وقت یمن میں جانا۔ مہمناں میں ایک مدت تک قیام کرنا۔ حجاز میں
 پنہنا۔ اسکندریہ مصر اور حبش کے واقعات اُس کے کلام میں مذکور ہیں +

شیخ نے دریا میں بھی بارہا سفر کیا ہے۔ خلیج فارس۔ بحر عمان۔ بحر ہند
 بحر عرب۔ بحر قلزم اور بحر روم میں اس کے متعدد سفر ثابت ہوتے ہیں۔ چیمبر
 ان سائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ وہ یورپ کے اکثر ملکوں میں پھلا ہے لیکن
 شیخ کے کلام سے کہیں یہ بات ثابت نہیں ہوتی۔ اکثر تذکرہ نویس لکھتے ہیں
 کہ شیخ نے جوڑہ حج پیادہ پائے ہیں۔ اور خود شیخ کے کلام سے بھی ایسا ہی
 ثابت ہوتا ہے۔ وہ ایک سفر کا حال بوستان میں اس طرح لکھا ہے کہ بیابان
 فید میں ایک رات نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ میں چلتے چلتے سر راہ پڑ کر سو رہا۔ مجھے
 سے ایک فترت سوار آیا اور اُس کی نکیل میرے سر پر مار کر کہا کہ کیا تو نے مرنے
 کا ارادہ کیا ہے جو جس کی آواز سن کر بھی نہیں اٹھتا بیابان فید میں کا
 اس حکایت میں ذکر ہے ایک صحراے لق ووق چھ تئو میل لمبا اور چار سو میل
 چوڑا ہے۔ جو حجاج کوفہ سے مکہ معظمہ کو جاتے ہیں ان کے رستے کے چوں بیچ
 یہ ایک بستی ہے جس کے نام سے یہ صحرا مشہور ہے۔ فید کوفہ سے تقریباً
 ۲۵ میل ہے۔ اور اس قدر مسافت پر وہاں سے مکہ معظمہ ہے۔ اس صحرا

میں پانی نہایت کمیاب ہے اور آبادی کہیں نظر نہیں آتی ایسی راہ ہے پیادہ
 حج کو جانا ناگاہر کرتا ہے کہ شیخ نے کیسی کیسی صعوبتیں سفر میں اٹھانی ہیں +
 کریم خاں زونو نے اپنے عہد حکومت میں شیراز کے قریب ایک احاطہ بنوایا
 ہے جو ہفتن کے نام سے مشہور ہے اس میں سات مجہول الاسم درویشوں کی
 قبریں بنی ہوئی ہیں اور احاطے کے دروازے پر شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی
 غنیمتیں نصف قد کی لگی ہوئی ہیں۔ کپتان کلارک نے جو بوستاں کا ترجمہ
 انگریزی چھاپا ہے۔ اس میں شیخ کی اس تصویر کا فوٹو بھی چھاپا ہے۔ شیخ کی
 شبیہ میں ایک کشتول اس کے ہاتھ میں اور ایک تہر اس کے کندھے پر ہے جو
 اس کے سفر کرنے والوں کی خاص علامت ہے +

شیخ کے کلام سے بھی جا بجا یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ بے سرو سامان اور
 متوکل درویشوں کی طرح سفر کرتا رہا ہے۔ اور بعض مرقعوں پر اس کو حالت سفر
 میں نہایت سخت تکلیفیں اور ایذائیں پہنچی ہیں +

ساتویں صدی ہجری اور بارہویں صدی عیسوی کے وسط میں جب کہ صلیبی
 لڑائیوں کا سلسلہ فلسطین میں ختم ہوا تھا اور سلطان اور عیسائیوں کے باہم سخت
 خصومت عداوت ہو رہی تھی شیخ بڑا ایک سخت واقعہ گزرا ہے جو کراچی اور گلستان
 کے دوسرے باب میں لکھا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک بار اہل دمشق سے ملاص
 ہو کر اس نے بیابان قدس یعنی فلسطین کے جنگلوں میں رہنا اختیار کیا تھا اور وہیں
 سے ملنا جملنا چھوڑ دیا تھا۔ آخر وہاں کے عیسائیوں نے اس کو پکڑ کر قید کر لیا
 ملے یعنی صاحب ایک سیاح نے اپنے ایران کے سفر میں اس تصویر کا مختصر حال لکھا ہے +

اُس وقت طرابلس الشرق یعنی مشرقی ٹریپولی میں شہر کے استحکام اور حفاظت کے لیے خندق تیار ہو رہی تھی اور یہودی اسیروں سے رجن کو یورپ کے عیسائی بلیکریا اور ہنگری وغیرہ سے گرفتار کر کے ساتھ لائے تھے، مزدوری کا کام لیا جاتا تھا۔ شیخ کو یہودیوں کے ساتھ خندق کے کام پر لگایا۔ مدت کے بعد حلب کا ایک مقرر آدمی جو شیخ کا واقف کار تھا اُس طرف سے گزرا اور شیخ کو پہچان کر اُس سے پوچھا کہ یہ کیا حالت ہے۔ شیخ نے کچھ درد انگیز اشعار پڑھے اور یہ کہا کہ خدا کی قدرت ہے! جو شخص یگانوں سے کوسوں بھانگتا تھا وہ آج بیگانوں کے پنجہ میں گرفتار ہے۔ رئیس حلب کو اُس کے حال پر رحم آیا اور دہل دینار دیکر شیخ کو قید فرنگ سے چھڑا دیا اور اپنے ساتھ حلب میں لے گیا۔ اُس کی ایک بیٹی ناکتھا تھی شیخ کا نکاح ستودینار مہر مقرر کر کے اُس کے ساتھ کر دیا۔ کچھ مدت وہاں گزری۔ مزیوی کی بد مزاجی اور زباں درازی سے شیخ کا ذمہ ناک میں آگیا۔ ایک بار اُس نے شیخ کو یہ طعنہ دیا۔ کہ کیا آپ وہی نہیں جس کو میرے باپ نے دہل دینار دیکر خریدا ہے! شیخ نے کہا میں بیشک میں وہی ہوں! دہل دینار دیکر مجھے خریدا اور ستودینار پر آپ کے ہاتھ بیجا۔

نفحات الانس میں لکھا ہے کہ شیخ نے بہت مدت تک بہت المقدس اور شام کے شہروں میں سقانی کی ہے۔ غالباً وہی زمانہ ہے جس کا ذکر اس حکایت میں کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُس پر ایسی ایسی تکلیفیں اور سختیاں اکثر گزری ہیں وہ گھستاں میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ میں نے کبھی زمانے کی سختی اور آسمان کی گونش کا شکوہ نہیں کیا۔ مگر ایک موقع پر دامن استقلال ہاتھ سے چھوٹ گیا کہ دمیر کے

پاؤں میں جوتی تھی اور نہ جوتی خریدنے کا مقدور تھا۔ اسی حالت میں ٹھگین اور تنگ دل کونے کی جامع مسجد میں پہنچا۔ وہاں ایک شخص کو دیکھا کہ جس کے پاؤں ہی سرے سے نہ تھے۔ اُس وقت میں نے خدا کا شکر کیا اور اپنے ننگے پاؤں غنیمت سمجھے +

عالم غربت میں کبھی کبھی غسرت اور تنگی کا ہونا ایک لازمی امر تھا۔ مگر شیخ ایسے موقعوں پر خود داری کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ ایک سال اسکندریہ میں جب کہ شیخ وہاں موجود تھا نہایت سخت تھپڑا اور درویشوں پر بہت سختی گزرنے لگی۔ اُس زمانے میں وہاں ایک بیچڑانہایت دولت مند تھا۔ غریبوں اور پروسیوں کو اُس کے ہاں سے کھانا یا نقدی ملتی تھی۔ کچھ درویش جو غالباً شیخ کے رفقا میں سے تھے۔ شیخ کے پاس آئے اور اُس سے بھڑکے کے ہاں دعوت میں چلنے کی ترکیب کی۔ شیخ نے اُن کے ساتھ دعوت میں چلنے سے انکار کیا اور کہا کہ شیر کھوک کے مارے مڑ بھی جائے تو بھی کتے کا جو ٹھا نہیں کھاتا +

شیخ کے وقائع سفر میں جو کہ اُس نے گلستاں اور بوستاں میں بیاں کیے ہیں سب سے زیادہ عجیب سمرناں کا واقعہ ہے جو بوستاں کے اٹھویں باب میں مذکور ہے۔ یعنی شیخ لکھتے ہیں کہ ”جب میں سمرناں میں پہنچا اور بلبل آویسوں کو دیکھا کہ ایک بہت کی پرسنش کے لیے دُور دُور سے وہاں آئے ہیں اور اُس سے مراد میں مانگتے ہیں تو مجھ کو تعجب ہوا کہ جاں دار ایک بیجان چیز کی کہیں لیے پرسنش کرتے ہیں۔ اس بات کی تحقیق کے لیے میں نے ایک برہمن سے ملاقات پیدا کی۔ ایک روز اُس سے پوچھا کہ یہ لوگ اس بے حس

تہمت پر کیوں اس قدر فریفتہ ہیں اور اُس کے سامنے ثورت کی سمیت بیعت اور عقارت کی برہمن نے مندر کے پوجاریوں کو خبر کر دی۔ سب نے محسوس کیا کہ گھیر لیا۔ میں نے مصلحتاً اپنے سرگرم سے کہا کہ میں نے کوئی بات بد اعتقادی سے نہیں کہی تھی خود اس ثورت پر فریفتہ ہوں لیکن چونکہ میں نووارد ہوں اور اسرارِ نہانی سے ناواقف ہوں اس لیے اس کی حقیقت و دریافت کرنی چاہتا ہوں تاکہ سمجھ لو چھ کر اس کی پوجا کر دوں۔ اُس نے یہ بات پسند کی اور کہا کہ آج رات کو تو مندر میں رہ۔ بجہ کو اصل حقیقت معلوم ہو جائیگی۔ میں رات بھر وہاں رہا۔ صبح کے قریب تمام بستی کے مرد و عورت وہاں جمع ہو گئے اور اُس ثورت نے اپنا ہاتھ اٹھایا، جیسے کوئی دعا مانگتا ہے۔ یہ دیکھتے ہی سب بچے بچے پکارنے لگے۔ جب وہ چلے گئے تو برہمن نے ہنس کر مجھ سے کہا کہ مکیدوں اب کو کچھ شبہ باقی نہیں رہا، اُنیں ظاہر داری سے ڈونے لگا اور اپنے سوال پر شرمندگی اور افعال ظاہر کیا۔ سب برہمنوں نے مجھ پر مہربانی کی اور میرا ہاتھ پکڑ کر اُس ثورت کے سامنے لے گئے جس نے ثورت کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اور بظاہر چند روز کے لیے ابرہمن بن گیا۔ جب مندر میں میرا اعتبار بڑھ گیا۔ تو ایک روز رات کو جب سب چلے گئے تھے میں نے مندر کا دروازہ تو بند کر دیا۔ اور ثورت کے تخت کے پاس جا کر غور سے دیکھا اور دھڑکتا شروع کیا۔ وہاں مجھے ایک بزدل نظر آیا جس کے پیچھے ایک پوجاری چھپا بیٹھا تھا۔ اور اُس کے ہاتھ میں ایک ڈونڈ تھی۔ معلوم ہوا کہ جب وہ اُس ڈونڈ کو کھینچتا ہے تو اُس ثورت کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے۔ اسی کو عام لوگ اُس کا کرتہ سمجھتے ہیں۔ اُس پوجاری نے جب دیکھا کہ اتر فاش ہو گیا وہ کھسکا ہوا ہو کر وہاں سے بھاگا۔ میں بھی اُس کے پیچھے دوڑا اور اُس

خوف سے کہ کہیں مجھ کو پکڑوا کر مروا نہ ڈالے۔ اُس کو پکڑ کر ایک کنوے میں گرا دیا۔ اگلے بعد میں فوراً وہاں سے بھاگ نکلا اور ہندوستان میں ہوتا ہوا انجمن کے رستے حجاز میں پہنچا۔

اس حکایت پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ ایک ایسے بڑے مندر میں جہاں ہزاروں پوجاری اور سیکڑوں جھن گانے والے مزد اور عورت اور سیکڑوں جاترمی شب و روز موجود رہتے تھے وہاں ایک مشتبہ آدمی کو ایسا موقع کیونکر ملا کہ تمام مندر میں اُس کے سوا کوئی متنفذ باقی نہ رہا۔ اس کے سوا ایسے ستائے کے وقت جب کہ مندر میں کوئی متنفذ موجود نہ تھا۔ پردے کے پیچھے ایک پوجاری کا ڈور تمام کزن ٹینا کرس غرض سے بٹھا ہوا کیوں تھا؟

اس اعتراض کے جواب میں صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ شاید یہ واقعہ یعنی موت میں جانا اور مندر میں ہندو بنکر رہنا اور ایک شخص کو اپنی جان کے خوف سے کنوئیں میں ڈھکیل کر بھاگ جانا صحیح ہو۔ مگر اس صورت میں یہ ضرور ماننا پڑیگا کہ اس واقعہ کے تمام جزئیات کی تصویر شیخ سے پوری پوری نہیں کھینچ سکی۔ اہل یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ نظم میں بیان کیا جاتا ہے تو شاعر کو اکثر وزن و قافیہ کی ضرورت ہے کہیں کہیں اہل علم میں ضرور کمی بیشی کرنی پڑتی ہے اور بعض اوقات وہ شاعرانہ خیالات کی رو میں بہ کر اصل واقعہ سے دُور بڑھ جاتا ہے۔ پس اگر اُس واقعہ سے کسی کی غرض متعلق نہیں ہوتی تو کسی کو اُس کی طرف التفات نہیں ہوتا۔ وہ نہ اہل غرض کو اُس پر اعتراض کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مثلاً شیخ نے پوتاں کے اسی باب میں ایک بادشاہ زادے کی حکایت صرف کیا۔ رہ بیت کی لکھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لکھنؤ

سے گر کر اُس کی گردن کو ایسا صدمہ پہنچا تھا کہ وہ ہر پھر نہ سکتی تھی مگر ایک حکیم کے علاج سے اچھی ہو گئی۔ کسی قدر صحت کے بعد جب طبیب ملے تو آیا تو اُس کی طرف کچھ التفات نہ کیا۔ طبیب وہاں سے دل میں ناخوش ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے روز ایک دوا بھیجی کہ اُس کی دھونی سے بالکل آرام ہو جائیگا۔ اُس سے بادشاہ کو ایک چھینک آئی۔ اور اُس کی گردن جیسی چوٹ لگنے پر ہو گئی تھی ویسی ہی بھر ہو گئی۔ اسی حکایت کو شیخ نے ایک ۳۴ بیت کی مثنوی میں جو مروج میں بیان کیا ہے اور یہ اُس کے کلیات میں موجود ہے۔ ان دونوں مثنویوں میں تمثیل کے جزئیات مختلف ہیں۔ مختصر حکایت میں سرزمین یونان کا حکیم اور طوالاتی حکایت میں صرف حکیم لکھا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بوٹی بھیجی تھی۔ اور دوسری جگہ ایک تخم بھیجا تھا۔ ایک جگہ بادشاہ کا قصہ لکھا ہے۔ اور دوسری جگہ ایک نبوآرام کا۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ اُسی دوا کی دھونی سے چھینک آئی۔ دوسری جگہ چھینک وغیرہ کا کچھ ذکر نہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نظم میں بشرطیکہ ناظم کو حسن بیان اور زینت الفاظ کا پورا پورا خیال ہو تو قصے کے جزئیات کا اپنی اصلی حالت پر باقی رہنا نہایت دشوار ہے۔ پس یہ نسبت اس کے کہ شیخ پر غلط بیانی کا الزام لگایا جائے یہ بہتر ہے کہ اُس کے بیان کو اس مقام پر ادا سے مطلب میں قاصر سمجھا جائے +

شیخ کا سفر کے بعد وطن میں آنا

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ شیخ نے سعد زنگی کی ابتدا سے حکومت میں تحصیل علم کے لئے ترک وطن اختیار کیا تھا۔ سعد زنگی چھٹی صدی کے آخر میں تخت نشین ہوا۔ اور ۲۳۱ھ

س وفات پائی۔ غالباً شیخ شیراز سے بھل کر سعد زنگی کے زمانے میں وطن نہیں آیا۔
 وکنہ اس نے شیراز سے چلتے وقت وہاں کی حالت ابتر و خراب دیکھی تھی۔
 مایک اوزبک پہلوان اور سلطان غیاث الدین کے حلقے اور شہر کا تاخت و تاراج
 و نا اہنی آنکھ سے دیکھ گیا تھا۔ مگر جب سعد زنگی کا بیٹا قلیغ خاں ابوبکر اپنے باپ کی
 بلکہ تختِ سلطنت پر متمکن ہوا تو اس نے فارس کو جو دو سو برس سے موردِ آفات و
 وادش تھا۔ چند روز میں سرسبز و شاداب کر دیا۔ اگرچہ مورخین نے اس کی تعریف میں
 بہت مبالغے کیے ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی خوبیوں کے سبب
 بہ انتہا شہرت اور نیکنامی حاصل کی تھی۔ اطراف و جوانب سے مشائخ و زہاد اس کی
 نہرت سُن کر آتے اور اُن کی کمالِ تعظیم و احترام کیا جاتا تھا۔ شیراز کی خانقاہیں
 ببادت خانے۔ مدرسے اور مسجدیں جو ویراں ہو گئی تھیں، اُس کے عہد میں آباد
 لی گئیں۔ اور ایسی عمارتوں کی امداد کے لیے گاؤں اور جاگیریں وقف کیں۔ ایک
 نقا خانہ شیراز میں بنوایا اور بڑے بڑے حافظِ طبیب اُس پر مامور کیے اپنی دہشتگردی
 و درخشنِ تدبیر سے ملکِ فارس کو ہمیشہ مغول تانہ کے سیلاب بلا سے جس کی کہیں چناہ
 نہ تھی محفوظ رکھا۔ اور سلسلہ سے سلسلہء سلطنت کی مدت تک اس کے
 عہد میں بھی شیخ نے شیراز کا رخ نہیں کیا اور اطراف و جوانب میں سیر و سیاحت
 کرتا رہا۔ مگر جب ابوبکر کا شہرہ دور و نزدیک برابر سننے میں آیا اور وطن کا شتیان
 بھی حد سے زیادہ گزر گیا اور وطن میں قرار و اطمینان قائم ہو گیا تب شام
 سے عراقِ عجم ہوتا ہوا اور اصفہاں میں ٹھہرنا ہوا جیسا کہ بوستاں کی ایک حکایت
 سے مفہوم ہوتا ہے شیراز میں پہنچا۔ شیخ کے کلیات میں ایک قطعہ ملا ہے۔ جس سے

ثابت ہے کہ اُس نے ایک مدتِ دراز کے بعد ابو بکر سعد کے عہد میں شیراز کی طرف سے معاودت کی تھی۔ وہ قطعہ بجینہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ قطعہ

۱۔ ندانی کہ سن در اقا لیم غربت
چرا روزگارے بکردم درنگی؟
۲۔ ہردوں رفتہ از تنگ ترکانِ دیدم
جہاں در ہم افتادہ چوں سوئے نگی

۳۔ ہمہ آدمی زادہ بودند لیکن
چہ گزشتگان بخونخوری تہ چنگی
۴۔ دروں مردے چوں ملک نیکمضر
بروں لشکرے چوں ہنر بان چنگی
۵۔ چو باز آدم کشور آسودہ دیدم
پیشگان رہا کردہ توے ملنگی
۶۔ چہاں بود در عہدِ اول کہ دیدم
جہاں از آستو بن تشویش درنگی
۷۔ چہنیں شدہ و آیم سلطانِ مال
تا ایک ابو بکر بن سعد زنگی

۸۔ شہر کے اندر فرشتہ خصلت لوگ تھے اور باہر لشکر
کے لوگ جنگی شیروں کے موافق تھے +
۹۔ جب میں پلٹ کر آیا تو ملک کو آسودہ پایا، گو روزِ اول
نے درندگی کی خصلت چھوڑ دی تھی +
۱۰۔ اگلے زمانے میں جب کہ ملک کو آشفستہ اور پریشان
دورنگ دیکھا تھا ملک کا وہ حال تھا +
۱۱۔ اور اب بادشاہِ عادل ابو بکر بن سعد زنگی کے
عہد میں یہ حال ہو گیا ہے +

شیراز میں پہنچ کر خا ہر شیخ نے جامعہ علم و فضیلت اُتار کر بلا سے طاق لکھ دیا
لکھا کیونکہ تا ایک ابو بکر میں باوجود اُن تمام غموں کے جو اوپر مذکور ہوئے ہیں
ایک نہایت سخت عیب بھی تھا۔ وہ ہمیشہ عملاً و نقلاً سے بدگمان رہتا تھا۔ اور

جاہل فقیروں اور درویشوں کو بہت کچھ دیتا اور ان کے ساتھ کمالِ ارادت و عقیدت ظاہر کرتا۔ اسی بدگمانی کے سبب سے چند جلیل القدر ائمہ و علمائے کواثر سے جبرائیل شیراز سے منکلوادیا تھا۔ ازاجملہ امام صدر الدین محمود واعظ اور امام شہاب الدین تودہ ہشتی اور مولانا غلام الدین ابراہیم قیسی کو کہ اقسامِ علوم میں یگانہ روزگار تھے۔ بہت زجر و تہدید کے ساتھ شیراز سے منکلوادیا۔ قاضی عبدالدین علوی جو کہ سندی سید اور دارالملک کا قاضی القضاۃ تھا اس کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا۔ صاحب سید عبداللہ بن اسعد کو جو کونینیش ایب تھا اور سوزنگی کا نہایت عالی مرتبہ وزیر تھا۔ ماخوذ کیا اور مع اس کے بیٹے تاج الدین محمد کے ایک قلعہ میں کوبادیا۔ یہاں تک کہ وہ قید ہی میں مر گیا۔ اسی سبب سے اہل علم اپنا کمال علمی ظاہر کرنے سے ڈرتے تھے اور اکثر جملہ شیخ کے لباس میں جلوہ گر ہوتے تھے۔ تاریخ و صفات میں لکھا ہے کہ ایک جاہل آدمی مشیخت مآب بن کر ابوبکر کے دربار میں آیا۔ اتابک نے اس کی بہت تعظیم و تکریم کی اور جب نماز مغرب کا وقت آیا تو اسی کو امام بنایا۔ شاہ صاحب نے قرأتِ غلط پڑھی مگر جس قدر انھوں نے قرأت میں غلطیاں کیں اسی قدر اتابک کو ان کے ساتھ زیادہ عقیدت ہوئی اور بہت کچھ دیکر انھیں رخصت کیا۔

پس شیخ کے لیے علما کے لباس میں رہنا زیادہ خطرناک تھا کیونکہ بہت سی صفات اس میں ایسی جمع تھیں جن کے سبب سے اس کا مرجعِ خلافت بنتا ایک ضروری امر تھا مثلاً علم و فضل۔ شاعری لطیفہ گوئی و بدلتہ سخن۔ فقر و درویشی وغیرہ وغیرہ اور اہل علم کے مرجعِ خلافت بننے سے ابوبکر ہمیشہ خائف رہتا تھا۔ اس کے علاوہ اہل علم اور عالموں کے چال چلن پرخروہ گیری کرنی، ریاکار فقیروں اور جاہل درویشوں کی قلعہ کھولنی

اور اسی طرح کے اور بہت سے مفید خیالات اپنی نظم و منت میں ظاہر کرنے شیخ کا اصلی مقصد تھا اور اس عرض کے لیے علما اور داعین کے لباس میں رہنا ہرگز مناسب نہ تھا۔ ظاہر ہو سکا سبب سے جیسا کہ گلستاں کے دیباچے میں مذکور ہے۔ ایوب کر کے دربار میں بہت کم جاتا تھا۔ زیادہ تر سعد بن ابی بکر کو جس کا نہایت دردناک مرض شیخ کے کلیات میں موجود ہے اس سے آرامت اور عقیدت ملتی اور اسی کے نام پر گلستاں لکھی گئی ہے۔

خود مختار سلطنتوں میں کوئی نئے رائے کی آزادی اور خاص کر بادشاہوں کے چال چلن پر آزادانہ رائے دینے سے زیادہ خطرناک نہیں ہوتی۔ مگر شیخ نے جس کے وقت میں ہر بادشاہ حاکم علی الاطلاق تھا اس فرض کو پورا پورا ادا کیا۔ سلطان عہد کے اخلاقی عیب اور ان کی بد خصلتیں جس طرح اُس نے بیان کی ہیں آزاد سلطنتوں میں بھی اُس سے زیادہ لکھتی مشکل ہیں مگر اُس نے ایسے لطیف پہلوئوں میں ان پر چٹیں کی ہیں کہ کسی کو گرفت کا موقع نہیں ملا۔

اکثر سلاطین سلف کی حکایتوں کے ضمن میں موجودہ بادشاہوں کے چال چلن پر اُس نے تشریحات کی ہیں۔ کہیں مدحیہ قصائد میں ادل مدح و ستائش کی تھوڑی سی چاٹ دیکر نصیحت و پند کا دفتر کھولا ہے اور ان کو ظلم و تعدی کے بُرے نتائج سے متنبہ کیا ہے۔ اور طرح طرح سے رعیت کے حقوق بتائے ہیں۔ اور ان کی بے اعتدالیاں ظاہر کی ہیں۔ تاہم جو عمل کا محال اور مشائخ و زہاد کا حد سے زیادہ معتقد تھا اُس کی تنبیہ کے واسطے گلستاں اور جوتہاں میں اس نے بہت سی حکایتیں لکھی ہیں۔ مثلاً گلستاں کی ایک حکایت میں کسی درویش کا حال لکھا ہے جو کہ جنگل میں جاتا تھا اور درختوں کے پتے کھاتا تھا۔ ایک بادشاہ اُس کی زیارت کو گیا اور اُس کو شہر میں لے آیا اور ایک

عمدہ بستانسرایں آتا رہا۔ چند روز جو اچھے اچھے کھانے کھانے کو اور نفیس کپڑے پہننے کو اور خوبصورت نوٹیاں خدمت کرنے کو ملیں اور ہر طرح کا آرام اور آسائش پائی، شاہ صاحب نے خوب رنگ و روغن نکالا۔ ہیئت اور صورت بالکل بدل گئی۔ ایک دن بادشاہ قدوسی کے لیے حاضر ہوا۔ اور کہا جس قدر کہ مجھ کو عملاً اور زہاد سے محبت ہے ایسی اور کسی گروہ سے نہیں۔ فیلسوف و زیر نے عرض کیا حضور! شرط دوستی یہ ہے کہ دونوں کے ساتھ بھلائی کجا اور اس لیے عملاً کو روپیہ دینا چاہیے تاکہ وہ اطمینان سے درس اور نصیحت میں مصروف رہیں اور زاہدوں کو کچھ دینا چاہیے تاکہ وہ اپنے زہد پر قائم رہیں +

ایک اور اس سے زیادہ لطیف اور چبھتی ہوئی حکایت اسی باب میں لکھی ہے جو بالکل اتنا بک ابوبکر کی حالت کے مناسب ہے یعنی ”ایک بادشاہ کو سخت ٹھٹھائی آئی اُس نے منت مانی کہ اگر اُس میں کامیابی ہوگی تو اس قدر روپیہ زاہدوں کی نذر کر دینگا۔ جب اُس کی مُرد پوری ہو گئی تو اپنے عہد کے موافق روپیوں کی پھیلی غلام کو دی۔ کہ زاہدوں کو جا کر دے آئے۔ غلام بہت ہوشیار اور زیرک تھا۔ سارے دن ادھر ادھر بھرا اور شام کو پھیلی ہاتھ میں لیے جیسا گیا تھا ویسا ہی چلا آیا اور صبح کیا حضور! ہر چند دھونڈا مگر کوئی زاہد نہیں ملا۔ بادشاہ نے کہا تو کی جگہ ہے میرے نزدیک اس شہر میں چار سو زاہد سے کم نہ ہونگے۔ کہا حضور! جو زاہد ہیں وہ تو لیتے نہیں اور جو لیتے ہیں وہ زاہد نہیں۔ بادشاہ یہ بات سن کر کہنٹس پڑا اور فرمایا۔ جتنی کہ مجھ کو درویشوں اور چندا پرستوں سے عقیدت ہے اُسی قدر اس مُرد کو اُن سے عداوت ہے مگر کتنا سبب سچ ہے +

اسی طرح اور بہت سی حکایتیں گلستاں اور بوستاں میں موجود ہیں۔ گلستاں کی ایک حکایت

میں جو کہ جدال سعدی کے نام سے مشہور ہے اُس نے نہایت خوبصورتی سے سلاطین و ملوک و مشائخ و بزرگار کے عیب اور برائیاں بیان کی ہیں۔ اس حکایت میں اُس نے اپنا اور ایک مدویش کا غالباً فرضی مناظرہ لکھا ہے جس میں مخالفت کو درویشوں کا اور اپنے کو امیروں اور بادشاہوں کا طرفدار و مدافع قرار دیا ہے۔ مخالفت بار بار درویشوں کی تعریف اور دولت مندوں کی مذمت کرتا ہے۔ اور فصیح ہو کر خود اُس کی تردید میں درویشوں کے عیب اور امیروں کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ مگر جیسی مضبوط دلیلیں اپنے دعوے پر قائم کرتا ہے ویسی ہی مضبوط دلیلیں خصم کی طرف سے لکھتا ہے۔ اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک فرضی مناظرہ ہے جو محض درویشوں اور تو نگروں کی تنبیہ اور اصلاح کے لیے لکھا گیا ہے۔

بادشاہوں کے جو رد و ظلم اور بیباکی و سفاکی دیکھتے دیکھتے شیخ کے دل میں فی الواقع بنی نوع کی خیر خواہی کا سچا جوش پیدا ہو گیا تھا جس کو کوئی خوف اور اندیشہ رُک نہ سکتا تھا۔ ایک بار جب کہ حج کر کے تبریز میں پہنچا اور وہاں کے علماء و صلحاء سے ملاقات کی اُس نے یہ ارادہ کیا کہ خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور اُس کا چھوٹا بھائی علاء الدین جوینی جو کہ سلطان ابا قاسم کے مہتمم و وزیر تھے اور شیخ کے ساتھ خاص ارادت رکھتے تھے ان سے بھی ملاقات کرے۔ ایک روز ان کے ملنے کا ارادہ کر کے چلا۔ راہ میں دیکھا کہ ابا قاسم کی سواری آتی ہے اور اُس کے دونوں وزیر اُس کے ہمراہ سوار ہیں۔ شیخ نے چاہا کہ وہاں سے کتر کر نکل جائے۔ مگر دونوں بھائیوں نے اُس کو پہچان لیا۔ اور فوراً گھوڑوں سے اتر کر شیخ کی طرف آئے۔ اور نہایت عظیم اور ادب سے شیخ کو سلام کیا اور اُس کے ہاتھ اور پاؤں پر بوسے دیے۔ بادشاہ نے جو یہ حال دیکھا، حاضرین سے کہنے لگا کہ شمس الدین نے نبھی نبھی کیا۔ یہی تنظیم بھی اس راہرو آدمی کے برابر نہیں کی، یہ کون شخص ہے؟ جب

دونوں بھائی شیخ سے مل کر واپس آئے۔ تو آباقا خاں نے خواجہ شمس الدین سے پوچھا کہ یہ کون شخص تھا جس کی تم نے اس قدر تعظیم کی۔ صاحب دیوان نے عرض کیا۔ حضور! یہ ہمارا شیخ ہے۔ حضور نے سنا ہوگا۔ شیخ سعدی اسی کا نام ہے۔ اور اس کا کلام ایک عالم میں مشہور و معروف ہے۔ آباقا خاں نے کہا۔ اس سے ہکو بھی ملو! چنانچہ دونوں بھائی ایک روز شیخ کی خدمت میں گئے۔ اور اُس کو بادشاہ کے حضور میں لانے۔ کسی قدر صحبت کے بعد جب شیخ چلنے لگا تو بادشاہ نے کہا کہ مجھ کو نصیحت کرو۔ شیخ نے کہا، دنیا سے آخرت میں کوئی چیز سا تھرنہ جائیگی، مگر نیکی یا بدی اب تم کو اختیار ہے جو منظور ہو سولجی!۔ آباقا خاں نے کہا۔ اس مضمون کو نظم کرو، تو بہتر ہو۔ شیخ نے اُسی وقت یہ قطعہ نظم کر کے پڑھا قطعہ

شے کہ پاس رعیت نگاہ می دارد حلال باو خراجش کہ مؤرد چوبانیست
 و گردن راعی خلق است نہ ہواشین باد کہ ہر چی می خورد ازہ جزئ مسلمانانست

آباقا خاں یہ قطعہ سن کر ابدیدہ ہو گیا۔ اور کئی بار شیخ سے پوچھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں؟ شیخ ہر بار یہی جواب دیتا تھا کہ اگر آپ راعی ہیں تو پہلی بیت آپ کے مناسب حال ہے ورنہ دوسری بیت *

آباقا خاں شیخ کی آواز دانہ بند و موعظت سے نہایت خوش ہوا اور شیخ کو بہت

عزت سے رخصت کیا *
 علی بن احمد جامع کلیات شیخ، اس مقام پر لکھتا ہے کہ ہمارے زمانے کے مشائخ و محکمہ ایسی بے باکانہ نصیحت ایک بقال کو بھی نہیں کر سکتے اور اسی لیے زمانے کا جو حال ہے وہ سب پر روشن ہے *

میں کتا ہوں کہ شیخ کے یہ کلمات اُس وقت اور بھی زیادہ قدر کے لائق ہو جاتے ہیں۔ جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آبا قبا خاں ہلاک و خاں کا بیٹا اور چنگیز خاں کا پوتا تھا جو اسلام اور مسلمانوں کے ہانی دشمن تھے۔ اگرچہ آبا قبا خاں کو مسلمانوں سے ویسی نفرت نہ تھی لیکن بہر حال وہ اسلام سے بیگانہ تھا۔ اور ایک مسلمان شیخ یا داعظ کو اُس کے سامنے ایسی جرأت کرنی نہایت دشوار تھی ایسا کام اُسی شخص سے ہو سکتا ہے جس کو نہ جان کا خوف ہو نہ فائدے کی امید، جیسا کہ شیخ نے گلستاں میں خود لکھا ہے۔

”نصیحت بادشاہاں گفتن کسے را مسلم است کہ ہم سر نذر دوا میدرز“ *

سرور انگلانو، جو بعد زوالِ خاندانِ اتابکیہ کے عشرہ میں سلطان آبا قبا خاں کے حکم سے صوبہ فارس کی امارت اور حکومت پر مقرر ہوا تھا۔ ایک مغل صاحبِ ہیبت مثالِ نہایت رعب والا اور اپنے مذہب میں نہایت سنجہ تھا۔ اور ہمیشہ علما سے اسلام سے مذہبی بحثیں کیا کرتا تھا۔ اور اُس کی ہیبت سے بڑے بڑے اہل منصب اترتے تھے۔ غالباً اُس نے شیخ سے درخواست کی تھی جس کے موافق شیخ نے نہریں ایک پند نامہ جو اُس کے کلیات میں موجود ہے سرور مذکور کے نام لکھ کر بھیجا ہے۔ اس پند نامہ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے بادشاہ حاکم اور عادل شیخ کے کلام کی نسبتاً تعظیم کرتے تھے۔ اور اُس کی تلخ نصیحتوں کو شہد سے زیادہ شیریں سمجھتے تھے۔ سرور انگلانو، کی شان میں شیخ نے قصائد بھی لکھے ہیں جو سراسر نصیحت و پند سے بھرے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض قصائد دو تین مدحیہ اشعار کے سوا سراسر پند و معظت ہی میں ختم کر دیے ہیں *

شیخ کی عقیدت و ارادت ممالکِ ایران کے سوا شام وغیرہ میں بھی ایسی ہی تھی

جیسی فارس اور عراقِ عجم میں چنانچہ ایک دفعہ دمشق کی جامع مسجد میں حضرت یحییٰ کی تربت پر متعلک تھا۔ عرب کا ایک بادشاہ جو ظلم اور بے انصافی میں مشہور تھا مسجد میں آیا اور نماز و دعا سے فارغ ہو کر شیخ کے پاس گیا۔ اور کہا مجھ کو ایک سخت دشمن سے حملے کا اندیشہ ہے آپ میرے لیے دعا کریں۔ شیخ نے کہا کمزور عیبت پر رحم کرنا کہ زبردست دشمن سے محفوظ رہے۔ جس نے بدی کا بیج بویا اور نیکی کی امید رکھی اس نے ایک لغو خیال پکایا اور بیہودہ امید باندھی ہے *

اگرچہ سلطنتِ عہد کے ایمان و ارکان میں شیخ کے معتقد اور ارادہ مند بے شمار تھے لیکن خواجہ شمس الدین صاحب دیوان جس کے نام پر شیخ نے اپنے ایک مجبورۂ نظم کا نام صا حیدۃ لکھا ہے اور اُس کا بھائی علاء الدین جس نے سب سے اول منول تاتاری فتوحات کے بیان میں تاریخ جہاں کشا لکھی ہے۔ شیخ کے ساتھ ایک خاص قسم کا خلوص اور محبت یا عقیدت رکھتے تھے۔ اس مقام پر کچھ مختصر حال ان دونوں بھائیوں کا لکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے *

مُجین جو کہ خراسان میں ایک سرسبز اور سمور خطہ تھا۔ یہ دونوں بھائی وہاں کے ہندی سادات میں سے ہیں۔ انھوں نے اپنے علم و فضل اور عقل و دانش کے ذریعے سے خانان تاتار کے عہدِ حکومت میں اپنا مرتبہ وزارت تک پہنچایا تھا۔ ہلاکو خان نے وزیرِ سیف الدین کی شہادت کے بعد اپنی وزارت بالاستقلال خواجہ شمس الدین جوینی کو عطا کی تھی۔ اور اُس کے چھوٹے بھائی علاء الدین کو ملک بنداد اور اُس کے مضامات پر حاکم مقرر کیا تھا۔ ہلاکو خان کے بعد آبا قاخاں باپ کا جانشین ہوا۔ تو اُس نے پہلے سے بھی شمس الدین کا زیادہ مرتبہ بڑھا دیا۔ اور سلطنت کی باگ بالکل

اُس کے قبضے میں دیدی۔ اب اُس نے مُہماتِ سلطنت کے انصرام۔ سپاہ و رعیت کی دلجوئی اور تمام ملکی خرابیوں کی اصلاح میں حد سے زیادہ کوشش کی۔ عراق، خراسان، بغداد، شام اور آرمینیا کے بادشاہ اور حاکم سب اُس کے مطیع اور فرماں بردار تھے۔ اُس کی فیاضی اور سخاوت کی دھوم دُور و نزدیک پہنچی تھی۔ باوجودیکہ اُس کا حکم کنارہ جیحوں سے شام اور ایشیا کے کوچک ملک نافذ اور جاری تھا۔ اس پر وہ علم و فضل کے ساتھ کمال تواضع اور انکسار سے پیش آتا تھا۔ اور اُن کے ساتھ حد سے زیادہ سلوک کرتا تھا۔ کبھی کسی پر اُس نے احسان نہیں جتایا۔ ہر طبقے اور ہر درجے کے لوگوں کی تعظیم اور مدارات اُن کے مرتبے کے موافق کرتا تھا۔ اور علاوہ کمالِ علمی کے علم ادب اور شعر میں بھی اُس کو یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ زیادہ تر اُسی کی بدولت تاتاریوں میں دین اسلام شائع ہوا اور اُسی کے فیضِ صحبت سے آباؤ اُخاں کے بھائی سلطان احمد نے اپنے گھرانے میں سب سے اول اسلام قبول کیا۔ آخر آخر غوغاں برادر سلطان احمد کے ہاتھ سے سلسلہ ہجری میں شہید کیا گیا۔ شہادت سے چند ساعت پہلے اُس نے تھوڑی سی مُہلت چاہی تھی۔ اُس نازک وقت میں نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے بیٹوں کے نام ایک وصیت نامہ تحریر کیا اور ایک خطِ مضملاً بے تبریز کو لکھا جو کتابچہ و وصفا میں بحسنہ منقول ہے اور جس سے اس کا کمالِ استقلال و رفراخ و صلگی پائی جاتی ہے۔

اس کے چھوٹے بھائی علاء الدین چغتائی نے بغداد کی حکومت کے زمانے میں اُس اُجڑے اور یران شہر کو جو کہ ہلاک و خاں کے ظلم و مباد سے بالکل پامال ہو گیا تھا۔ چند روز

لے سلطان احمد کا نام اسلام سے پہلے نکھوڑا تھا۔ تاتاریوں میں اس سے پہلے مرث بزرگ خاں، تاجی خاں، بایا اور دیگر بزرگ اپنا سلطان ہوا تھا۔ جس کے پاس خوارزم و دشتِ تبجان اور توس وغیرہ کی حکومت تھی۔

میں اپنے عدل و شفقت اور دلجوئی رعایا سے از سر نو مہمور کر دیا۔ بختِ اشرف میں نہر کھدوائی جس میں ایک لاکھ دینار سے زیادہ صرف ہوا۔ اور قنات کا پانی کوسوں کی مسجد میں لے گیا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ جو کام بڑے بڑے خلیفہ اور بادشاہوں سے نہ ہو سکے تھے وہ اس قیام اور دانشمند وزیر کی کوشش سے ظہور میں آئے۔

تاریخ جہان کشا، جو اُس نے تاریخوں کے فتوحات کے بیان میں لکھی ہے۔ وہ ان تمام تاریخوں کا ماخذ ہے جو اس باب میں لکھی گئی ہیں۔

الغرض یہ دونوں بھائی جو کہ دنیوی جاہ و اقتدار کے علاوہ کمالاتِ علمی میں بھی امتیاز رکھتے تھے اور نیک سیرتی اور حسنِ اخلاق کے لحاظ سے ہمیشہ تھے۔ شیخ سعدی کے ساتھ ان کو حد سے زیادہ خلوص اور اعتقاد تھا اور شیخ کو بھی جیسا کہ اُس کے قصائد و قطعات اور دیگر تحریرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان دونوں سے انتہا درجے کی محبت اور الفت تھی۔ ظاہرِ اجب سے شیخ نے سفر ترک کر کے شیراز میں اقامت اختیار کی تھی اُس کے تمام اخراجات اور اُس کی خانقاہ کے مصارف کے متکفل خواجہ شمس الدین اور خواجہ علاؤ الدین تھے۔

ایک بار خواجہ شمس الدین نے پانسو دینار بطور نذر کے اپنے غلام کے ہاتھ دے کر سلطنت تبریز سے شیخ کی خدمت میں بھیجے۔ راہ میں غلام نے شیخ کے معمولی اغراض و چشم پوشی کے پھر دسے پر اُس میں سے ڈیڑھ سو دینار نکال لیے اور ساڑھے تین سو شیخ کے حوالے کیے۔ شیخ نے دیکھا کہ صاحبِ دیوان کے خط میں پانسو لکھے ہیں اور غلام نے ساڑھے تین سو دیے ہیں اُس کی رسید میں یہ قطعہ لکھ بھیجا۔ قطعہ

خواجہ اشرف فرستادہی مال مالِ افروز بادِ خدمت پایمال

ہر دیناریت سارے عمر باد تائبانی سہ صد و پنجاہ سال
ترجمہ تم نے مجھ کو عزت دی اور نقدی بھیجی۔ بھاری دولت زیادہ اور تمہارے دشمن
پاکال ہوں۔ بھاری عمر فی دینار ایک برس کے حساب سے ہو چو تا کہ تم ساڑھے
تین سو برس دنیا میں رہو +

صاحب دیوان نے یہ مضمون دریافت کر کے غلام کو بہت زبردستی کی اور
رقم کی بابت تدارک مافات کر کے شیخ سے معافی چاہی۔ اس قسم کے مزاح آمیز
اشعار اور بھی کئی موقعوں پر شیخ نے صاحب دیوان کو لکھے ہیں۔ ایک بار اس نے
اپنی نظم و نثر کا مجموعہ خواجہ کو حسب الطلب بھیجا تھا، جب ایک مدت تک وہاں سے
رسید نہ آئی تو اس کے نقائص کے لیے یہ قطعہ لکھ بھیجا۔ قطعہ

سفینہء جلیات و نظم و نثر لطیف کہ بارگاہِ ملوک و صدور را شاید
لبدر صاحب صاحب قرآن فرستاد مگر بعین عنایت قبول فرمایہ
سفینہ رفت و ندانم رسید یا نہ رسید بد اں دلیل کہ آئندہ دیر می آید

ملہ برندق بخاری جو ایک دہر دست خاوع ہے اس کو بھی یہی اتفاق پیش آیا ہے۔ بادشاہ نے اس کو پانچو
تومان اخام میں بھیجے تھے مگر اس کو دس سو پہنچے اس نے یہ قطعہ بادشاہ کو لکھ بھیجا قطعہ
شاہ دشمن گداز دست نواز آں جہاں گیر کو ہماں دار است
بش یوزانتوں کرم مزد بین غبہ سلطان پر بندہ بسیار است
سہ صد از جملہ غائب است و کنوں در بر اتم دوسرہ بد را است
یا مگر من غلط شنو دستم یا کہ پروانہ چی طلبکار است
یا مگر در عبارت ترکی بش یوزانتوں دوسرہ بیار است
مگر اس قطعہ میں جیسا کہ ظاہر ہے شیخ کے قطعہ کی شوخی اور لطافت نہیں ہے۔ بش یوزانتوں کو بش یوز
پڑھنا چاہیے۔ یہ ترکی الفاظ ہیں جن کا ترجمہ پانچو تومان ہے +

پیارے اے ادیس حال مشورت بردم مگر ز خاطر من بند بستم بکشاید
 چہ گفت۔ گفت بذاتی کہ خواجہ دریکست نہ ہر سفینہ ز دریا درست باز آید
 ایک بار خواجہ علاؤ الدین نے جلال الدین فتنی کو جو کہ شیراز میں کسی جلیل القدر
 منصب پر مامور تھا تبریز سے حکم بھیجا کہ اس قدر دینار شیخ کی خدمت میں بھیج دو۔ مگر
 اُس وقت جلال الدین کا انتقال ہو چکا تھا اس لیے وہ رقم شیخ کے پاس پہنچی
 جب شیخ کو اس حال کی اطلاع ہوئی تو اُس نے ہنسی سے خواجہ علاؤ الدین
 کو یہ قطعہ لکھ بھیجا۔ قطعہ

پیام صاحب دیوان علی بدولت دیں کہ دیں بدولت آیام او ہے نازد
 رسید و پابع حرمت فرزند سعدی اے بنامند کہ سر پر فلک برا فرزند
 مثال داد کہ صدر رختن جلال الدین قبول حضرت اور اتھمدے سازد
 ولیک بر سر او خیل مرگ تاختہ بود چناں کہ بر بہہ ابنائے دہرے نازد
 جلال زندہ نخواہد شدن درین دنیا کہ بند گان حسد او زندگار بنوازد
 طمع بریدم از دور سرا ہے عجبے نیز کہ از مظالم مردم بمن نہ پروازد

ترجمہ۔ صاحب دیوان علاؤ الدین جس کے عہد دولت پر دین کو ناز ہے اسکی تحریر
 پہنچی اور سعدی کو عزت بخشی۔ قریب تھا کہ اُس کا سر آسمان تک پہنچ جائے۔ اُس تک
 حکم تھا کہ امیر جلال الدین اُس کے فرمان کی تعمیل کرے مگر اُس پر شکر اجل کی چڑھائی
 ہو چکی تھی جیسے کہ سب پہنچا کرتی ہے۔ اب جلال الدین دنیا میں آنے والا نہیں ہے
 کہ خدا کے بندوں کی خبر لے۔ میں نے آخرت میں بھی اُس سے امید قطع کی۔ کیونکہ وہاں
 لوگوں کے استغنائے اُس کو میری طرف کا ہیکو متوجہ ہونے دینگے +

خواجہ علاؤ الدین نے فوراً اُس کی تلافی کی اور عذر چاہا۔ شیخ کی خانقاہ جہاں اب اُس کی قبر ہے یہ بھی صاحبِ دیوان کے روپ سے بنی تھی۔ اس کام کے لیے پچاس ہزار دینار اُس نے شیخ کو دیے تھے۔ شیخ نے ہر چند اُن کے لینے سے انکار کیا مگر صاحبِ دیوان نے ہزار منت و سماجت اُس کو راضی کیا اور شیخ کی زندگی ہی میں اُس رقم سے ایک عالی شان مدرسہ یا خانقاہ پہاڑ کے نیچے جو کہ گوشہ شمال و مغرب میں شہر سے بٹا ہوا ہے بنوائی گئی اور شیخ آج عمر تک ہیں غلت نشین۔ شیخ سے اکثر اہل علم حقائق و معارف کے دقائق و غوامض پوچھتے تھے اور وہ ہر ایک کا جواب تحریر یا تقریر میں دیتا تھا۔ ازاں جلد علی بن احمد نے ایک قطعہ مولانا سعد الدین کا جو کہ علم و فضل کے سوا شاعری میں بھی مشاق و ماہر تھا، نقل کیا ہے جس میں یہ استفسار کیا گیا ہے کہ سالک کی رہنما عقل ہے یا عشق۔ چونکہ اس قطعہ سے اُس زمانے کے علماء کی رائے شیخ کی نسبت اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ قطعہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ قطعہ

سالک راہِ خدا باد شہر ملک سخن	اے زانفاظ تو آفاق پر از دورِ تمیم
اختر سعدی و عالم ز فروع تو منیر	واضع عقل گیتی ز نظیر تو عظیم
پیش اشعار تو شعر و کراں را چہ محل	سحر کے وقع نماید بر اعجابِ عظیم
بندہ را از تو ہواے است کہ توجیہ یوال	نکند مردم پاکیزہ سیرِ حشر پر کریم
مرد راہِ حق عقل نماید عشق	ایں در بستہ تو بکشاے کہ کیلے بہت عظیم
گر چہ میں ہر دو بیک شخص نیایند فرد	در دماغ و دلِ میدار تو بہت عظیم
پایہ منصب ہر یک ز کرمِ بارناے	تازانفاظ تو خشت تازہ شود جانِ مستقیم

باد آسودہ و فارغ زبد و نیک جہاں خاطر آئینہ کردار تو چون نفس حکیم
شیخ نے اُس کے جواب میں ایک طول طویل بحث و نشریں لکھتی ہے جو اس کے

کلیات میں موجود ہے +

معلوم ہوتا ہے کہ شیراز میں جو شخص حاکم ہوتا تھا وہ شیخ کا نہایت ادب و تعظیم
اور اطاعت کرتا تھا۔ سرو آرا نکیا نو، کو وہ برابر قصاید اور پند نامہ و نیرہ میں اس
طرح خطاب کرتا ہے جیسے بڑے اور بزرگ چھوٹوں کو کیا کرتے ہیں۔ اس کے سوا
ملک عادل شمس الدین جو کہ غالباً آنکھیا نو کے بعد شیراز کا حاکم ہوا تھا وہ بھی حد
سے زیادہ شیخ کی تعظیم اور عزت کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ شیراز میں فوج کے
سپاہیوں اور افسروں نے چوری سے سرکاری کھجوریں جو زمین کے محصول میں
زمینداروں سے وصول کی تھیں سبزی فروشوں کے ہاتھ حیرا کسی دعدے پر
منگے نرغ سے سجینی شروع کیں اور بہت سے بوجھ شیخ کے بھائی کی دوکان پر بھی
جو کہ خاص بادشاہی ڈیوڑھی کے پاس بقالی کی دوکان کرتا تھا بھجوائے شیخ
اُس زمانے میں حضرت ابو عبد اللہ ابن خنیف کی خانقاہ میں مجاور تھا۔ اُس کو بھی
اُس واقعے کی خبر پہنچی۔ اُس نے ملک شمس الدین کو جو کہ اس حال سے بے خبر تھا۔
ایک قطعہ لکھ بھیجا جس میں اہل فوج کی شکایت اور اپنے بھائی کی دوکانداری اور
بے نوائی کا حال لکھا تھا۔ شمس الدین نے فوراً اُس کا تدارک کیا اور خود شیخ کے
پاس آیا اور معافی چاہی اور ہزار درم پیش کر کے کہا کہ یہ حقیر رقم آپ کے بھائی کے

۱۵۔ بزرگوار چوتھی صدی ہجری کے اکابر و مفید میں سے ہیں جن کی نسبت خواجہ عبداللہ اصفہانی نے لکھی ہے۔
کہ حقائق و معارف میں کسی کی تصنیفات ابن خنیف سے برابر نہیں ملے گی +

خروج کے لیے ہے۔ اس کو قبول کیجیے۔ شیخ نے لے کر بھائی کو بھیج دی +
 شیخ کی وفات شیراز میں جب کہ آما بکان فارس کے خاندان کا خاتمہ ہو چکا تھا
 اور ولایت فارس خانان تاناری کی حکومت میں آگئی تھی سلسلہ ہجری میں واقع ہوئی۔
 کسی شاعر نے اُس کے مرنے کی تاریخ اس طرح کہی ہے۔ تاریخ

دربِ بحرِ معارف شیخ سعدی کہ در وریاے معنی بود عواص

مہرِ شوال روزِ جمعہ رُوحش بیاں در گاہِ رفت از رُوعِ اخلاص

یکے پر سید سالِ فوت لغتہم ز خاصاں بود ازاں تاریخ شد خاص

شیخ کی عمر کسی نے ایک سو دو برس کی اور کسی نے ایک سو دس برس اور

انہوں نے ایک سو بیس برس کی لکھی ہے۔ ہمارے نزدیک یہ پچھلا قول صحیح معلوم

ہوتا ہے۔ کیونکہ شیخ جیسا کہ بوستاں کی ایک حکایت سے معلوم ہوتا ہے جوانی کے

زمانے میں شیراز سے باہر گیا اور بغداد میں اُس نے مدتوں امام ابن جوزی

سے علم تحصیل کیا ہے۔ امام ابن جوزی کی وفات اس سے ۹۴ برس بعد واقع

ہوئی۔ پس اگر شیخ کی تمام عمر ایک سو برس کی سمجھی جائے تو لازم آتا ہے کہ شیخ زیا

سے زیادہ نو برس کی عمر میں امام ابن جوزی سے تحصیل علم کر چکا تھا اور ایک سو

برس کی قرار دیا جائے تو یہ لازم آتا ہے کہ وہ سترہ برس کی عمر میں تحصیل علم سے فارغ

سلسلہ متروک راوی نے اسکی وفات آتابک محمد شاہ ابن مظفر سلطنت شاہ بن سعد زنگی کے عہد میں لکھی ہے مگر یہ ایک

غلط ہے۔ آتابک محمد شاہ سلطنت ہجری میں تخت پر بیٹھا تھا اور آٹھ مہینے سلطنت کر کے مر گیا۔ پھر اس کے بھائی

سلجوق شاہ تخت نشین ہوا اور سلطنت ہجری میں قتل کیا گیا۔ پھر سعد زنگی کی بیٹی آیش خاتون کے نام سے لڑ

طریقہ جاری ہوا اور سلطنت عیسٰی اسکو مغرول کر کے سردار آقا خاں نے سردار آما کو جو شیخ کا مہربان ہے حاکم فارس

متحرک۔ بیگم کوئی متفسر آما بکان فارس کے خاندان کا حکمران نہیں ہوا پس شیخ کی وفات جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا غلط ہے

آتابک کے زمانے سے چوبیس برس بعد اور آتابک محمد شاہ کے عہد سے تیس برس بعد واقع ہوئی ہے +

ہو چکا اور شیراز سے پچپن ہی کے زمانے میں نکل گیا تھا پس جس طرح پہلی بات خلاف قیاس ہے اسی طرح دوسری بات خلاف واقع ہے +

سرگورادسلی نے انگلستان کے ایک سیاح ولیم فرنیکلن کے سفر نامہ سے جو کہ مشرق میں فارس گیا تھا۔ شیخ کے مدفن کا حال اس طرح لکھا ہے۔ کہ ”شیخ کا مزار مقام دلکشائے سنے ایک میل جانب شرق پہاڑ کے نیچے واقع ہے۔ عمارت اُس کی بہت بڑی اور مربع ہے اور قبر سنگین بنی ہوئی ہے۔ جس کا طول چھ فٹ اور عرض ڈھائی فٹ ہے۔ قبر کے تمام ضلعوں پر کچھ عمارت قدیم نسخ خط میں کندہ ہے۔ جس میں شیخ کا اور اس کی تصنیفات کا حال درج ہے۔ قبر ایک سیاہ رنگ کی چوبی قبر پوش سے جس پر سنہری کام ہو رہا ہے ڈھکی رہتی ہے اور اُس پر شیخ ہی کا ایک مشرق خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ جب اس قبر پوش کو ہٹاتے ہیں تو قبر کا تعویذ دکھائی دیتا ہے۔ اکثر اہل اسلام جو اطراف و جانب سے شیخ کے مزار پر آتے ہیں وہ پھول اور دیگر اقسام کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور زائرین کے مطالعے کے لیے ایک نسخہ شیخ کے کلیات کا نہایت خوشخط لکھا ہوا۔ مزار پر رکھا رہتا ہے۔ مقبرے کی دیواروں پر بہت سے فارسی اشعار لکھے ہوئے ہیں۔ جو لوگ دُور دست مقامات سے وہاں زیارت کو آئے ہیں۔ یہ اشعار انہوں نے لکھے ہیں۔ شیخ کے مقبرے کی عمارت اب روز بروز گر رہی جاتی ہے۔ اور اگر اب اس کی جلد خبر نہ لی گئی تو بالکل کھنڈر ہو جائیگی۔ نہایت افسوس کی بات ہے اور زمانے کا عجیب انقلاب ہے کہ کسی شخص کو اُس کی حرمت کرانے کا خیال نہیں۔ اس مقبرے کے متصل اکثر دینداروں اور بزرگوں کے مزار ہیں جنہوں نے اپنی خواہش سے یہاں دفن ہونا چاہا ہے“ +

اس کے بعد سرگوراوسلی صاحب لکھتے ہیں کہ ”اسکاء کے شروع میں جب کہیں
جائے سوم بادشاہ انگلستان کی طرف سے بعنوان سفارت فتح علی شاہ قاجار کے پاس
پیغام لے کر طہران کو جاتا تھا اس وقت کئی مہینے شیراز میں میرا مقام رہا۔ جب تک
میں وہاں رہا اکثر شیخ کے مزار پر جاتا تھا۔ مسٹر فرنیکن کے لکھنے کی تصدیق
شیخ کے مزار پر جا کر ہوتی ہے۔ اس کی قبر حقیقت میں بالکل بوسیدہ ہو گئی ہے
اور تمام عمارت عنقریب منہدم ہوا چاہتی ہے۔ باغ اور درخت جو زمانہ سابق میں
وہاں تھے ان کا آب نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ میرے دل میں یہ خیال آیا
کہ اگر ٹھوڑا سا روپیہ خرچ کیا جائے تو اس مقبرے کی مرمت بخوبی ہو سکتی ہے اور
میرے حسن عقیدت نے جو کہ میں شیخ اور اس کے کلام کے ساتھ رکھتا تھا۔ مجھ کو
امادہ کیا کہ اپنے پاس سے روپیہ صرف کر کے شیخ کے مقبرے کی مرمت کر دیا
مگر شاہ ایران کا پانچواں بیٹا حسین علی مرزا جو اس وقت فارس کا گورنر تھا۔ اس
نے اس ارادے سے مجھ کو باز رکھا۔ اور نہایت سرگرمی سے کہا کہ ”میں اپنے
روپے سے مزار کی مرمت کرادوں گا۔ آپ کیوں اس قدر تکلیف اٹھاتے ہیں اس
نے کہا کہ میں شیخ کے مزار کی مرمت اُسی اسلوب اور عمدگی سے کرادوں گا جیسے
کہ کریم خاں زند نے خواجہ حافظ کے مزار کی کرائی تھی لیکن افسوس ہے کہ
اُس نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا +

نہایت تاسف کا مقام ہے کہ عنقریب وہاں کوئی نشان ایسا باقی نہ رہے گا جس سے
معلوم ہو کہ وہ خطہ ایران کا محض جو زہد و تقویٰ اور ذہن و جدت اور علم و فضل میں
اپنا مثل نہ رکھتا تھا کمال اور کس جگہ دفن ہوا ہے؟ +

سبحان اللہ کیا عبرت کا مقام ہے کہ ایک عیسائی مذہب زمین کے اُس
 کنارے کارہنے والا جہاں دنیا کی آبادی ختم ہوتی ہے، باوجود اختلافِ مذہب
 اختلافِ قوم اور اختلافِ ملک کے ایک مسلمان مصنف کی ایسی قدر کرے
 کہ عالمِ سفر میں اُسکے مقبرے کی مرمت کرائے پر آمادہ ہو اور اپنے پاس سے روپیہ
 خرچ کرنے کو موجود ہو۔ اور ایک مسلمان شاہزادے سے باوجود اتحادِ دیناں
 اتحادِ مذہب۔ اتحادِ قوم و ملک کے ایسی بے قدری اور بے اعتنائی ظہور
 میں آئے ۛ

فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِيَ الْأَبْصَارِ ۝

دوسرا باب

شیخ کی تصنیفات

شیخ کی شاعری کی شہرت اس کی زندگی میں

شیخ کی جادو بیانی اور فصاحت و بلاغت کا چرچا اُس کی زندگی ہی میں تمام ایران ترکستان، تہانہ اور ہندوستان میں اس قدر پھیل گیا تھا کہ اُس زمانے کی حالت پلچاظ کرنے کے بعد اُس پر مشکل سے یقین آتا ہے۔ خود شیخ بھی گلستاں کے دیباچے میں کہتا ہے ”دو کربیل سعدی کہ در خواہ عوام افتادہ و صیت سخنش در سبط زین افتہ“ شیراز اور کاشغر میں کچھ کم ۶۷ سو میل کا فاصلہ ہے۔ پہلے اس سے کہ شیخ کاشغر میں پہنچے وہاں کے چھوٹے بڑے اُس کے کمالات سے واقف تھے ۛ

جس زمانے میں شیخ کاشغر پہنچا ہے۔ غالباً یہ وہ زمانہ ہے کہ چنگیز خاں چینی تاناکو خوارزمیوں سے فتح کر چکا ہے اور سلطان محمد خوارزم کے ساتھ چند روز کے لیے اُسکی صلح ہو گئی ہے۔ جب شیخ کاشغر کی جامع مسجد میں گیا تو وہاں ایک طالب علم مقدمہ زرخشری ہاتھ میں لیے زبان سے یہ کہہ رہا تھا کہ ضرب زید عمر ۱۔ شیخ اُس کے چپل کی باتیں کرنے لگا۔ اور کہامیوں صاحب! خوارزم و خطا میں صلح ہو گئی مگر زید اور عمرو کی خصوصیت بدستور چلی جاتی ہے۔ طالب علم ہنس پڑا اور شیخ کا وطن پوچھا۔ فرمایا۔ خاک پاک شیراز

ۛ علامہ جلال الدین زرخشری صاحب قریب شائستگی عربی زبان کی جو نہیں ایک مختصر متن لکھا ہے اُس تک نام مقدمہ زرخشری ہے ۛ

اُس نے کہا کچھ سعدی کا کلام یاد ہے؛ شیخ نے بطریق مزاح اُسی وقت دُوعربی شعر کہکر پڑھے۔ اُس نے کسی قدر تامل کے بعد کہا سعدی کا زیادہ تر کلام فارسی ہے اگر کچھ اُس میں ہے یاد ہو تو پڑھیے۔ آپ نے ویسے ہی دُو فارسی شعر پڑھے جن میں سے ایک یہ ہے۔

شعر

اے دل معشاق بدایم تو صید ماہ بہ تو مشغول و تو با عسر و مزید
صبح کو جب شیخ نے کا شعر سے چلنے کا ارادہ کیا کسی نے اُس طالب علم سے کہدیا
کہ سعدی یہی شخص ہے۔ وہ بھاگا ہوا شیخ کے پاس چلا آیا اور نہایت افسوس کیا
کہ پہلے سے آپ نے اپنا نام نہ بتلایا کہ میں آپ کی خدمت گزاری سے سعادت حاصل کرتا
اگر اب بھی چند روز شہر میں چل کر قیام کیجیے تو ہم لوگ خدمت گزاری سے مستفید ہوں
اُس کے جواب میں آپ نے یہ اشعار پڑھے۔

اشعار

بزرگے دیدم اندر کو ہمارے قناعت کردہ از دنیا بہ خارے

چرا گفتم بہ شہر اندر نیائی کہ بارے بند از دل بر کشائی

بلغفت آنجا پریر و یان نغسند چو گل بسیار شد پلایاں بغسند

اسی طرح مکران سے جو کہ شیراز سے چودہ سو میل ہے وہاں خان شیرید سلطان محنتاں
نے شیخ کی شہرت سن کر اُس کو وطن سے بلایا مگر وہ بڑھاپے کے سبب نہ آسکا۔

تبریز کے حام میں جو شیخ اور مشہور شاعر ہام تبریزی کی نوک جھوک ہوئی ہے وہ نہایت
مشہور قصہ ہے۔ جب تک ہام نے یہ نہ جانا کہ یہ شخص سعدی ہے تب تک اُس سے چھوٹا چلا کرتا
رہا۔ لیکن جب معلوم ہوا کہ یہ سعدی شیرازی ہے تو نہایت شرمندگی سے عذر معذرت

طلبہ خارج ہام الدین باوجود نسبت باطنی اور کالات علمی کے تبریز کے امرا میں سے تھا اور شاعری میں مہر میں اُس کو
مانتے تھے۔ محقق موسیٰ سے تفصیل علم کی تھی اور سخطہ بحریری میں یہ روایات پائی +

کر کے اپنے مکان پر لے گیا اور جب تک شیخ تبریز میں رہا کمال تعلیم اور ادب سے اُسکی مہماں داری کی +

تبریز کو بارہوی نے کتاب مجالس العشاق سے ایک حکایت نقل کی ہے جس کا خلاصہ یہ کہ حکیم نزاری قسطنطنیہ کے خراسان کا ایک مشہور شاعر اور حکیمانہ مزاج آدمی تھا اور اسماعیلی مذہب رکھتا تھا، شیراز کے حمام میں شیخ سے ایک اجنبی صورت میں ملا۔ معلوم ہوا کہ یہ شخص خراسان کا رہنے والا ہے۔ شیخ نے پوچھا کہ سعدی کو کوئی خراسان میں جانتا ہے؟ کہا اُس کا کلام وہاں عموماً زبان زدِ خلایق ہے۔ اور پھر شیخ کی درخواست سے اُس کے چند اشعار پڑھے جن کو سن کر شیخ محفوظ ہوا اور سمجھا کہ یہ شخص شعر کا عمدہ مذاق رکھتا ہے۔ آخر دونوں پر ایک دوسرے کی حقیقت کھل گئی +

شیخ نزاری کو اپنے مکان پر لے گیا۔ اور بہت دن تک اُس کو جانے نہ دیا۔ اور بہت خوشی سے خوب دل کھول کر اُس کی مہمانداری کی حکیم نزاری نے وہاں سے خیریت ہوتے وقت اپنے نوکر سے کہا کہ اگر ہمارا میزبان کبھی خراسان میں آیا تو ہم اُسکو دکھائیے کہ مہمانوں کی تواضع اور مدارات کس طرح کیا کرتے ہیں۔ یہ جملہ شیخ کے کان تک پہنچ گیا۔ اُس کو کہاں افسوس ہوا۔ اور یہ سمجھا کہ حکیم نے ہماری مہمانداری میں شاید کوئی قصور دیکھا۔ چند مدت کے بعد حسن اتفاق سے شیخ کا گزر قسطنطنیہ میں ہوا اور حکیم نزاری سے ملاقات ہوئی۔ حکیم بہت اخلاق اور محبت سے پیش آیا۔ گرد و غبار میں کچھ زیادہ تکلف نہیں کیا۔ پہلے روز جو کھانا دسترخوان پر آیا وہ محض رسمی اور سیدھا سا دہ تھا۔ دوسرے وقت ایک بھنے ہوئے تیر کے سوا کچھ نہ تھا۔ تیسرے وقت ایک گوشت کا اُبلایا ہوا پارہ اور خشک تھا۔ چلتے وقت حکیم نے شیخ سے معافی چاہی اور کہا کہ جس طرح آپ نے میری

منیافت میں تکلفات کیے تھے اُس طرح سے مہمان آخر کو بارِ خاطر ہو جاتا ہے لیکن ہمارا طریقہ ایسا نہیں ہے شیخ کو اُس جُملے کا مطلب جزئیاری نے شیراز سے چلتے وقت کہا تھا اب معلوم ہوا +

اس حکایت سے شیخ کی شہرت اور بلند آوازگی کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ مذہبی تعقیبات سے مُبرا تھا۔ فرقہ اسماعیلیہ کے لوگ اُس زمانے میں عمرًا محمد اور بے دین سمجھے جاتے تھے۔ اور کوئی فرقہ مسلمانوں کے نزدیک اسماعیلیوں سے زیادہ مجنوں اور مُرذد نہ تھا۔ پس شیخ کی کمال بے تعصبی تھی اُس نے ہمارے عہد کے مولویوں اور داعظوں کے برخلاف ایک غریب اسماعیلی کی اپنے وطن میں اس قدر ناظر و مدارات کی اور خراسان میں خود اُس سے جا کر ملا اور اُس کا مہمان رہا +

الغرض یہ حال شیخ کی شہرت کا خود اُس کے زمانے میں تھا اور اُس کے مرنے کے بعد جو عام قبولیت اُس کے کلام نے چال کی اُس کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں +

شیخ کے کلام پر اور لوگوں کی رائیں

اکثر تلیل القدر شعرا نے شیخ کی نسبت ایسے اشعار کہے ہیں جن سے اُن کی اصلی رائے شیخ کے کلام کی نسبت ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا عبد الرحمن جامی نے بہارستان میں کسی نساء کا قطفِ نقل کیا ہے جس میں فردوسی کو مثنوی کا۔ آنوری کو قصیدے کا۔ اور سعدی کو غزل کا پیمبر قرار دیا ہے اور وہ قطعہ یہ ہے قطعہ

در شعر سہ کس پیمبر اند ہر چہ کند کہ لاینبی بعدی
آیات و قصیدہ و غزل را شعر دوسی و آنوری و سعدی

تیر مولانا جامی نے نفحات الانس میں امیر خسرو دہلوی کی کثرت تصانیف اور مجاہدیت کے ذکر کے پیشیچ کو باعتبار مقبولیت کلام کے امیر برائے پیرایہ میں ترجیح دی ہے کہ امیر نے بھی خضر کی ملاقات کے وقت یہ درخواست کی تھی کہ اپنا آب و ہن اس کے منہ میں ڈالے حضرت خضر نے فرمایا کہ یہ دولت سعدی کے نصیب کی تھی +

حضرت امیر خسرو دہلوی نے بھی شیخ سعدیؒ اور ہام تبریزیؒ کو اپنی مثنوی سپہر میں غل کا اُستاد مانا ہے لیکن دیگر اصنافِ سخن میں کناپہ اپنے کو ترجیح دی ہے۔ مگر ایک اور شعر میں مطلقاً شیخ کے اتباع پر فخر کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ شعر خسرو بر سرست اندر ساغر معنی بخت شیرداز میسنائے مستے کہ در شیراز پڑ

حضرت امیر حسن دہلوی نے بھی جن کو اس کے اہل مذاق سعدی ہندوستان کہتے تھے شیخ کے نتیجے پر اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں۔ شعر حسن گلے گلستان سعدی آوردہ کہ اہل معنی گلچیں ازین گلستان اند

خواجہ مجد الدین ہرگز جو کہ شیخ کا جلیل القدر معاصر ہے اُس سے چار نامی گرامی فاضلین نے جن میں سے دو شخص علاوہ علم و فضل کے ہونا کو خاں کے رکنِ سلطنت بھی تھے یعنی خواجہ شمس الدین صاحب دیوان۔ امیر معین الدین پروانہ حاکمِ روم۔ ملک افتخار الدین کرانی اور ملا نور الدین صدری نے باتفاق ہمدرد ایک قطعہ مرتب کر کے تجددِ ہرگز کے پاس بھیجا تھا۔ جس میں آامی ہروی اور سعدی شیرازی کے کلام پر محاکمہ کی درخواست کی گئی تھی۔ اسکے جواب میں مجد ہرگز نے یہ رباعی لکھ کر بھیجی۔

رباعی

اگرچہ بر نطق طوطی خوش نصیب
بر شکر گفتہ با بے سعدی گسیم
در شیوہ شاعری بر اجماع ائم
ہرگز من و سعدی بہ امامی نہ سیم
اس رباعی میں اگرچہ ہرگز نے شیخ کو اپنے سے بہتر بتایا ہے مگر امامی کو اپنے اور
شیخ دونوں پر ترجیح دی ہے +

حاجی لطف علی خاں آزد نے مذکورہ بالا حکایت پر جو کچھ لکھا ہے وہ ملاحظہ کے
قابل ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ بعض متبعین شعر نے مجد الدین ہرگز سے کہ بنایت الہی ہستی طبع
میں آج اُن کا کوئی نظیر نہیں ہے۔ سعدی اور امامی کی بابت محاکمہ چاہتا تھا انھوں نے
جواب میں یہ رباعی تحریر فرمائی۔ میں نے اس رباعی کو پڑھ کر خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ ہمارے
دماغ میں ایسا اشتباہ کسی کو نہیں ہے (جیسا کہ محاکمہ چاہنے والوں کو تھا) اہل مذاق
جانتے ہیں کہ ہرگز کی تحقیق کیسی بھونڈی ہے۔ ہاں انھوں نے اپنی نسبت بالکل صحیح فرمایا ہے۔
کہ میں امامی کے درجے کو نہیں پہنچتا۔ بیشک امامی کا مرتبہ جناب صاحب رباعی سے بہت
بالا تر ہے لیکن کسی طرح اُس کو شیخ بزرگوار سے نسبت نہیں ہے۔ بلکہ تین شخصوں کے سوا
کسی اور کی مجال نہیں جو شیخ کی مساوات کا دم مار سکے میں اکثر یہ سوچا کرتا تھا کہ جیسا ہمارا
زمانہ دانشمندوں پر سخت گزرتا ہے ایسا زمانہ پہلے سخنوروں پر بھی گزرا ہے یا نہیں۔ جب یہ
حکایت میری نظر سے گزری تو مجھ کو صبر آگیا۔“ حاجی موصوف نے اس مقام پر مجد ہرگز کی شان
میں ایک قطعہ بھی لکھا ہے اور وہ یہ ہے۔ قطعہ

بلخ نے بھی اس رباعی کو سن کر ایک ایسی لہری ہے جو اُس کے کلمات میں موجود ہے یعنی سربا حاجی
ہرگز کہ بہ بارگاہِ سامی نہ رسد از بختِ سماہ و دہکلامی نہ رسد
ہرگز کہ بہ عیشِ خود نکرده است نماز شک نیست کہ ہرگز بہ امامی نہ رسد
تلمہ شایعین موصوف کے مراد فردوسی، انوری اور نظامی ہیں +

کیے گفت۔ امامی امام ہری را ز سعدی فزوں یافتہ مجد ہنگر
دریں ماجرا چیت را بے تو۔ گفتم ستمگر بود مجد ہنگر ستمگر

ہمارے نزدیک اگر مجد ہنگر اُس عصر میں جس میں سعدی اور امامی گزرے ہیں نہ ہوتا بلکہ سو بیچاس برس بعد پیدا ہوتا تو اُس کو بھی شیخ اور امامی کے رتبے میں ہرگز یہ اشتباہ نہ ہوتا۔ معاشرت نے لوگوں کے حالات پر اکثر ایسے پردے ڈالے ہیں مگر جس قدر اُن کا زمانہ گزرنے لگا اُسی قدر وہ پردے مٹتے ہوئے گئے۔ اور رفتہ رفتہ جو حق بات تھی وہ ظاہر ہو گئی۔ اصل یہ ہے کہ جب ایک زمانے میں دو اہل کمال ہوتے ہیں تو ہر ایک کے ساتھ ایک ایک گروہ متعصبین کا کھڑا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ہر شخص کے کچھ عزیز اور دوست اور کچھ اُن دوستوں کے دوست اور اسی طرح کچھ مخالف اور اُن مخالفوں کے دوست اور بچانے ضرور ہوتے ہیں اور اسی طرح سے بڑھتے بڑھتے دو بڑے بڑے گروہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ طبقہ ختم ہو جاتا ہے اور اُن کے ساتھ کسی کو لاگ یا لگاؤ باقی نہیں رہتا تو ٹھیک بات ہوتی ہے وہ بغیر بحث و محبت کے خود بخود دونوں پر نقش ہو جاتی ہے۔ شیخ اور امامی کے عہد میں یہ کس کو معاوم تھا کہ عنقریب ایک کا کلام اطراب عالم ہو جائیگا اور دوسرے کا نام صرف کتابوں میں لکھا رہ جائیگا +

کلام شیخ کی مقبولیت میں اکثر یہ حکایت بیان کی جاتی ہے کہ شائع وقت میں سے ایک بزرگ شیخ کے منکر کھتے۔ ایک رات اُنھوں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان کے دروازے کھولے گئے ہیں اور فرشتے نور کے طبق لے کر زمین پر نازل ہوئے ہیں۔ اُن بزرگ نے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے؟ کہا سعدی شیرازی نے ایک بیت کہی ہے جو جناب الہی میں مقبول ہوئی ہے یہ اُس بیت کا صمد ہے اور وہ بیت یہ ہے۔ بیت

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار ہر دورے دفتریت معرفت کردگار
جب وہ بزرگ خواب سے بیدار ہوئے تو رات ہی کو شیخ کے عزت خانے پر یہ مژدہ سنانے
کے لیے گئے۔ وہاں جا کر شیخ کو دیکھا کہ چراغ روشن کیے ہوئے جھوم جھوم کر یہ شعر
پڑھ رہے ہیں۔ شاید اس حکایت کا مضمون بادی النظر میں مستقبل معلوم ہو۔ لیکن
ہم کو اس میں کوئی نئی بات عقل یا سچ کے خلاف نہیں معلوم ہوتی۔ خواب کا سچا ہونا
اور ان میں معمولی باتوں کا غیر معمولی طور پر نظر آنا ایک ایسا مسلمہ ہے کہ آج کل کے
فلسفی بھی اس کا انکار نہیں کر سکتے۔ اس کے علاوہ ہم اس حکایت سے ہر حال میں یہ
نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ شیخ کے کلام کی مقبولیت اس درجے کو پہنچ گئی تھی کہ معمولی
پیرائے اس کے بیان کے لیے کافی نہ سمجھے جاتے تھے +

اس حکایت کو اور زیادہ چمکانے کے لیے شیخ ابو فیض فیضی کے مخالفوں نے
ایک اور دلچسپ مضمون تراشا ہے یعنی یہ کہ فیضی نے نلدین کی توبہ لکھتے وقت
جب یہ شعر کہا۔

در ہر بن موم کی نمی گوشش تو ارہ فیضی دست در جوشش
تو اس نے بھی ویسے ہی صلے کے توقع میں جو شیخ سعدی کو ملا تھا آسمان کی طرف منہ
کیا۔ اتفاقاً ایک پیل نے اوپر سے پچال کی جو فیضی کے منہ پر آکر پڑی۔ وہ بہت جھنجھلایا
اور کہا ”شعر فحش عالم بالا معلوم شد“، ظاہر ہے مضمون شیخ عبدالحق دریداؤنی کا جو کہ
شیخ مبارک خاندان کا سخت دشمن ہے یا اس کے کسی متبع کا گڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے +
چیمبرز انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے کہ ”سعدی کے کلام کی لطافت اور بزرگ سنجی نفا
کے مشہور شاعر ہوں میں کے کلام سے بہت ملتی ہے۔ چونکہ سعدی کو لاطینی زبان آتی

تھی۔ اس لیے ملحق غالب ہے کہ وہ ہورس کے کلام سے مستفید ہوا ہوگا۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ قیاس کہاں تک صحیح ہے؛ اور واقع میں شیخ کو لاطینی آتی تھی یا نہیں۔ ظاہر یہ ویسا ہی قیاس ہے جیسا کہ دہلی کی جامع مسجد اور آگرہ کے روضۂ تاج گنج کی نسبت کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں عمارتیں اٹلی کے کاریگروں نے بنائی ہیں۔ بات یہ ہے کہ جو قوم نہایت ہستی کی حالت میں ہوتی ہے اگرچہ وہ کسی زمانے میں کتنی ہی ترقی کر چکی ہو جس طرح اس قوم کی موجودہ نسلیں ترقی یافتہ قوموں کی نظر میں حقیر ذلیل و بیچ دبیچ معلوم ہوتی ہیں اسی طرح اُن کے اسلاف کی عظمت اور برتری کا بھی بہت کم یقین آتا ہے اور اگر اُن کی کوئی ایسی بات پیش کی جاتی ہے جس کا کسی طرح انکار نہیں ہو سکتا تو اسکو مجبور کسی اور طرف منسوب کرنا پڑتا ہے۔

سردیم جونس جو کہ مشرقی زبانوں کا نہایت مشہور عالم ہے اُس نے جو شیخ اور اُس کے کلام کی نسبت لکھا ہے وہ سرگورادسلی نے نقل کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ ”سعدی نے تیرہویں صدی عیسوی میں جب کہ اتابکان فارس وہاں کے اہل کمال کو لغت و فہم تھے اپنے جوہر دکھانے شروع کیے تھے۔ حالانکہ اُسکی تقریباً تمام زندگی سفین گدزی تھی باوجود اُس کے کسی ایسے شخص نے بھی جس کو تمام عمر بھرا طینان اور فرصت حاصل رہی ہو، اپنی عقل اور محنت کا نتیجہ شیخ سے بہتر نہیں چھوڑا۔“

انگلستان کے بعض ارمیٹھنوں نے اُس کو مشرقی شکسپیر کہا ہے۔ اگرچہ یہ تشبیہ اُن مشرقی شاعروں کی نظر میں جو شکسپیر کی شاعری سے واقف نہیں ہیں کچھ زیادہ قوت نہیں رکھتی۔ لیکن جب یہ بات مسلم ہے کہ انگریز شکسپیر کو تمام دنیا کے شاعروں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ تو دیکھنا چاہیے کہ جو لوگ سعدی کو مشرقی شکسپیر کہتے ہیں انہوں نے اُس کو کس درجے کا

شاعر تسلیم کیا ہے +

شکسپیر کی شاعری اگرچہ سعدی کی شاعری سے بالکل مغائر ہے لیکن بعض حیثیات سے ایک کو دوسرے سے تشبیہ دی جاسکتی ہے۔ دونوں کے کلام میں عموماً یہ بات پائی جاتی ہے کہ وہ عقل و عادت کی سرحد سے تجاوز نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ نچرل حالتوں کی تصویر کھینچتے ہیں۔ دونوں کے کلام میں اکثر ظرافت اور شوخی کی چاشنی ہوتی ہے اور دونوں کا بیاں ہمیشہ سادہ صاف اور دلنشین ہوتا ہے۔ اس کے سوا دونوں نے اکثر کلام کی بنیاد نصیحت و پند پر رکھی ہے۔ صرف فرق اس قدر ہے کہ شیخ کھلم کھلا نصیحت کرتا ہے اور شکسپیر کے پلے (یعنی ناٹک) میں اس کو کسی شخص کو یہ خیال نہیں گزرتا کہ یہ میرے بھنسنوں کے عیب بیان ہو رہے ہیں یا کسی کو نصیحت کی جاتی ہے۔ مگر اس کا بیان مذہبی انداز اپنا کام کرتا ہے۔ بلکہ یہ گہنی منتر صریح نصیحت و پند سے زیادہ کارگر ہوتا ہے۔ نیر و نون کا کلام مقبول اور دلنشین ہونے میں ایک دوسرے سے نہایت مشابہت رکھتا ہے۔ جس طرح شکسپیر کے صدمہ ہا اقوال انگریزی میں ضربِ اشل ہو گئے ہیں اسی طرح پنج کی گلستاں اور بوستاں کے صدمہ ہا فقرے اور شعر اور مصرعے فارسی اور اردو میں ضربِ اشل ہیں۔ اور اس سے دونوں کے کلام کی کمال خوبی اور حسن اور یہ بات لگانے کے مور کے دلوں پر کس قدر تسلط کیا ہے اور ان کا کلام کس قدر انسان کی حالتوں اور روتوں کے مطابق واقع ہوا ہے ثابت ہوتی ہے اگرچہ اس کا زیادہ تر سبب یہ بھی ہے کہ شیا میں جس قدر گلستاں اور بوستاں کی تعلیم و تعلم کا چرچا ہے ایسا کسی اور کتاب کا نہیں۔ اور اسی طرح یورپ میں جس قدر شکسپیر کا کلام دائر و سائر ہے ایسا کسی اور شاعر کا نہیں۔ پس ضرور ہے کہ دونوں کے اقوال سب سے زیادہ لوگوں کی زبانوں پر جاری

ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جب تک کوئی کلام فی نفسہ مقبول اور دلنشین ہونے کے قابل نہ ہو، کسی طرح ممکن نہیں کہ اس طرح ملک میں مشہور اور متداول ہو سکے +

کلیات شیخ

شیخ کا تمام کلام نظم نثر فارسی۔ اور عربی جو اس وقت متداول ہے اور جس کو شیخ علی ابن احمد ابن ابی بکر نے شیخ کی وفات سے بیاسیس برس بعد علی الترتیب جمع کیا ہے حسب تفصیل ذیل ہے۔

۱۔ نثر میں چند مختصر رسالے (جن میں سلوک اور تصوف کے مضامین اور مشائخ و عرفا کی حکایتیں اور ملوک و محکام کے لیے نصیحتیں لکھی ہیں) +

۲۔ گلستاں +

۳۔ بوستاں +

۴۔ پند نامہ (جس کی عرف عام میں کیا کہتے ہیں) + ۵۔ قصائد فارسی (جن میں مرثیے، مہتمات۔

مشائخات اور ترجیحات بھی شامل ہیں) + ۶۔ قصائد عربیہ +

۷۔ غزلیات کا پہلا دیوان موسوم بطلیبات + ۸۔ دوسرا دیوان موسوم بہ بدائع +

۹۔ تیسرا دیوان موسوم بہ خواتیم + ۱۰۔ غزلیات قدیم جو غالباً عنفوان شباب

کی لکھی ہوئی ہیں + ۱۱۔ مجموعہ موسوم بہ صلاحتیں جس میں شیخ نے قطعاً

مشوئیات مدباعت اور مفردات کو خواجہ شمس الدین صاحب دیوان کی فرمایش سے

ایک جگہ جمع کر دیا ہے + ۱۲۔ مطالبات۔ و ہزلیات +

ان تمام کتابوں اور رسالوں میں سے مشنوی پند نامہ یعنی گویا کو بعض اہل مذاق شیخ کا کلام نہیں سمجھتے کیونکہ اہل کو کلیات کے اکثر قدیم نسخوں میں یہ مشنوی نہیں دکھی گئی۔ دوسرے

شیخ کے کلام میں جو بیچگی اور جزالت یا دلفری اور جادو پایا جاتا ہے اُس سے یہ مثنوی متعارف ہے۔ مگر ہمارے نزدیک اس مثنوی کو شیخ کی طرف نسبت کرنے میں کوئی استبعاد اور تردد کی بات نہیں ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ ہوتاں اور شیخ کی عام نظم کے مقابلے میں نہایت کم وزن معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ شاعر کا حال بالکل اس شعر کا مصداق ہے۔ شعر

گئے بر طارم اسے انشیم گئے بر پشت پاسب خود ز بنیم

ایک ہی شاعر کا ایک کلام معجزہ معلوم ہوتا ہے اور دوسرا ہزارین اور یہی وہ خاصیت ہے جو خدا کے کلام کو بشر کے کلام سے جدا کرتی ہے۔ **تَحْمَاتُ قَالَ اللَّهُ تَعَالَى وَكَوْكَانَ مِنْ عَيْنِهِ غَيْرَ اللَّهِ لَوْ جَدُّ وَافِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا**۔ کلیات کے بعض قدیم نسخوں میں اس مثنوی کا نہ پایا جاتا بھی اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ وہ شیخ کا کلام نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ علی بن احمد کے بعد کسی کو یہ مثنوی ملی ہو اور اُس نے اُس کو کلیات میں داخل کر دیا ہو۔ اور اس سبب سے کلیات کے نسخوں میں اختلاف واقع ہو گیا ہو۔ چنانچہ حضرت امیر خسرو کے کلیات میں اسی طرح نسخوں کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ بہر حال ہم جس طرح اس مثنوی کے ثبوت کی کوئی قطعی دلیل نہیں سمجھتے اسی طرح اُس کی نفی کی بھی کوئی قوی وجہ نہیں پاتے +

آب ہم شیخ کی بعض تصنیفات پر جو زیادہ مشہور ہیں یا زیادہ لحاظ کے قابل ہیں متوجہ ہوتے ہیں۔ جہاں تک ہماری محدود واقفیت اور ناچیز رائے مساعدت کرے گی ہم اُن کی حقیقت ظاہر کرنے میں کوشش کریں گے +

ناظرین باحکیم سے یہ درخواست ہے کہ اگر کہیں ہماری رائے کی غلطی ظاہر ہو تو اس کو متعصبانہ اذرا و تفریط پر محمول نہ فرمائیں۔ بلکہ اُس کو ایک متقصاے بشریت

سمجھ کر اسی قدر مواخذے کے قابل ٹھیرائیں۔ جس قدر کہ ایک غلط گمراہی راستے پر مواخذہ ہو سکتا ہے۔

گلستاں اور بوتستاں

اگرچہ تصنیف و تالیف کی ماہیت اور ان کے عیب و درخوہاں بیان کرنی عموماً مشکل نہیں۔ لیکن جو کلام سب کے نزدیک مقبول ہو اور جس پر کسی نے خردہ گیری نہ کی ہو اس کتاب پر دیو لکھنا اور اس کی خوبی یا عیب بیان کرنا حد سے زیادہ مشکل ہے جس طرح ہر بیانات پر استدلال کرنا نہایت دشوار ہے۔ اسی طرح اسی مقبول اور مستحکم کتابوں کے محاسن بیان کر کے مشکل میں۔ اور اسی طرح ان پر نکتہ چینی کرنی اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ ہم پہلا انسان کام کسی قدر اپنے ذمے لیتے ہیں۔ اور دوسرے مشکل کام کو اپنے سب سے زیادہ دقیقہ شناس اور باریک بین لوگوں پر چھوڑتے ہیں۔

ان دونوں کتابوں کو شیخ کے کلام کا خلاصہ اور لب لباب سمجھنا چاہیے۔ ظاہر فارسی زبان میں کوئی کتاب ان سے زیادہ مقبول اور مطبوع خاص و عام نہیں۔ ایران، ترکستان، کاکمہ، افغانستان، اور ہندوستان میں ان دونوں کتابوں کی تعلیم ساڑھے چھ سو برس سے جاری رہی ہے۔ یہ کتابیں ان کتابوں کی تعلیم شروع ہوتی ہے اور پڑھائیے تاکہ طالب علم کا شوق رہتا ہے لاکھوں استادوں نے انھیں پڑھایا۔ اور کئی ہزاروں شاگردوں نے انھیں سے پڑھا۔ ان کے پیشانیوں پر خوشنویسوں کے قلم سے لکھے گئے اور بے انتہا توشیح لکھے اور پتھر پر چھاپے گئے۔ مشرق اور مغرب کی اکثر زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے۔ شیخ اور علمائے ان کی عزت کی۔ بادشاہوں نے ان کو سلطنت کا دستور اہل بنایا۔

منشیوں اور شاعروں نے ان کی فصاحت و بلاغت کے آگے سر جھکا یا اور ان کے
تبع سے عاجز رہنے کا اقرار کیا۔ اس کا نام جس طرح ایشیا میں مشہور ہے اسی طرح
یورپ میں بھی عزت سے لیا جاتا ہے +

اگرچہ یہ دونوں کتابیں حسن قبول - فصاحت - بلاغت - تہذیب - اخلاق پند
نصیحت اور اوراکثر خوبیوں کے لحاظ سے باہم و گرامی مشابہت رکھتی ہیں کہ ایک
دوسری پر ترجیح دینی مشکل ہے بلکہ ان پر عربی کا یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ اَحْسَنُ
أَفْضَلُ مِنْ أَلَا خَيْرَ لیکن اگر بعض وجود سے گلستاں کو بوستاں پر ترجیح دیجائے
تو کچھ بجا نہیں ہے +

فارسی نظم میں بوستاں کے سوا اور بھی ایسی کتابیں موجود ہیں جو بوستاں سے
کم مقبول نہیں سمجھی گئیں۔ مگر مثنوی معنوی اور شاہنامہ نے شاید اس سے بھی بڑھ کر
قبولیت حاصل کی ہے۔ لیکن فارسی نثر میں ظاہر کوئی کتاب شیخ سے پہلے اور اس کے
بعد ایسی نہیں لکھی گئی جو گلستاں کے برابر مقبول ہوئی ہو +

تبرکہ گورائوسلی نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ سعدی کی گلستاں کا ترجمہ جو کہ مشہور
چائل چٹنٹینس نے لاطینی میں کیا تھا۔ اس نے صدیوں یورپ کے اہل علم و ادب
کو شیخ کے خیالات پر فرامینہ رکھا ہے +

تذکرہ مجمع الفصحا جو کہ ابھی ایران میں تالیف ہوا ہے اس میں یا کسی اور تذکرے
میں لکھا ہے کہ فارسی نظم و نثر میں جس قدر چار کتابیں ایران میں مقبول ہوئی ہیں ایسی اور
کوئی کتاب مقبول نہیں ہوئی۔ شاہنامہ مثنوی معنوی۔ گلستاں اور دیوان حافظ +
ہندوستان میں بھی یہ چاروں کتابیں ایسی ہی مقبول ہوئی ہیں جیسی ایران میں مگر

سب کی شہرت اور قبولیت کے وجہ مختلف ہیں۔ اگرچہ ایک خوبی مبنی بیان کی سادگی اور بے ساختگی میں چاروں کتابیں کم و بیش مشترک ہیں اور یہ وہ خوبی ہے جس کے بغیر کوئی کتاب مقبول نہیں ہو سکتی لیکن صرف اس قدر خوبی سے کوئی کتاب ایسی شہرت اور قبولیت کے درجے کو نہیں پہنچ سکتی جب تک اس کے ساتھ کوئی اور دلکش اور دلچسپ چیز نہ ہو۔ کیونکہ نظم و نسق کی بیسیوں کتابیں جو تکلف اور تصنع سے بالکل پاک ہیں ایسی بھی ہیں جن کا کوئی نام بھی نہیں جانتا +

ہماری رائے میں گلستاں کے سوا باقی تینوں کتابیں زیادہ تر اس سبب سے مقبول ہوئی ہیں کہ وہ اپنی سادگی اور فصاحت و بلاغت کے علاوہ نمانے کے مذاق اور طبع کے ساتھ بہت مناسب رکھتی تھیں۔ سب سے اوّل شاہنامہ پرغور کا قطع نظر اس سے کہ قدیم زمانے کے حالات اور گزشتہ قوموں اور بادشاہوں کے محالاً انسان کو ہمیشہ باطلع مرغوب ہوتے ہیں جس زمانے میں کہ شاہنامہ لکھا گیا۔ اس وقت وسط ایشیا کے مسلمانوں کو فتوحات اور لشکر کشی و کشور کشائی کا شوق حد سے زیادہ بڑھا ہوا تھا۔ اور شجاعت و بہادری کے مضمون ان کو دل پسند آتے تھے۔ پس ایک نئے مہم کا جس میں رزم اور بہادری کے سوا اور مضمون بہت کم ہیں ایسے وقت میں لکھا جاتا ہو اس کی حالت کے نہایت مناسب تھا۔ یہی سبب تھا کہ شاہنامہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس کی صد ہا داستانیں کم و بیش لوگوں کی زبانوں پر جاری ہو گئی تھیں۔ اور آخر کو اس کا یہاں تک رواج ہو گیا تھا کہ بادشاہوں کے ہاں شاہنامہ خواں نوکر رکھے جاتے تھے۔ اور قومہ خانوں میں جا بجا گڑھے صحبت کے لیے شاہنامہ پڑھا جاتا تھا۔ اس کے سوا ہزاروں عجیب و غریب قصے جیسے سیرع کا زالی کو پرورش کرنا۔ ظمورث دیوبند کا دیو

کو قید کرنا۔ جام حبشید کے کرشمے۔ رستم کا اپنے زور سے تنگ آکر اس کو خدا کے پاس اہمیت رکھوانا اور پھر شہاب کی لڑائی میں واپس لے لینا۔ اس کا سیکڑوں دیوؤں کو مارنا اور مغلوب کرنا۔ اس کے رخن کا شیروں کو ہلاک کرنا۔ دژ بہمن کا طلسم ٹوٹنا اور اسی طرح کے ہزاروں افسانے مثل قفقہ امیر حمزہ اور بوستان خیال کے اس میں موج تھے۔ جو تمام دنیا کے آدمیوں کو عموماً اور ایشیاء والوں کو خصوصاً ہمیشہ سے مرغوب رہے۔

ہیں۔ ان باتوں نے شاہنامہ کو اور بھی زیادہ مقبول اور عام پسند کر دیا تھا۔ مولانا روم کی مثنوی اس زمانے میں لکھی گئی تھی جب کہ ہمارے لٹریچر میں تصوف اور معرفت کا تسلط روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ شیخ محی الدین ابن العربی شیخ صدر الدین قزوینی شیخ شہاب الدین سہروردی شیخ علاء الدولہ سمنانی وغیرہم کی تصنیفات مذہب اور شاعری میں تصوف کی روح پھونک رہی تھیں۔ شعریں حقیقت اور مہر کے مضامین تغزل کی نسبت زیادہ جی بھانے لگے تھے۔ شیخ اکبر اور ابن فارض کے دیوانوں کے سامنے مستثنیٰ اور ابو تمام کی تشبیہیں بے مزہ معلوم ہونے لگی تھیں۔ حلقہ اور منطق الطیر نے رُود کی اور عنصری کا کلام نظروں سے گرا دیا تھا۔ ایسے وقت میں مثنوی معنوی کا جو کہ سراسر تصوف اور حقائق و معارف سے بھری ہوئی ہے مقبول ہونا ایسا ہی ضروری امر تھا۔ جیسے غوثیہ اور سکا جتھ کے عہد میں شاہنامہ کا اور صفویہ کے عہد میں حملا حیدری کا ہیں کے سوا مثنوی میں بھی صد با عجیب و غریب قصے اور فوق العادت تعلیم اور تمثیل جو انسان کو بالطبع مرغوب ہیں درج تھیں اور ان میں شریعت اور طریقت کے اسرار بیان کیے گئے تھے۔ پس مثنوی میں شعر اور تصوف کے علاوہ قصے کا لطف اور مذہب کی عظمت بھی شامل تھی۔ یہی باعث ہے کہ مولانا روم

کے حق میں رع نیست پنہیں بروئے دارو کتاب + اور منہوی کے
 حق میں رع ہست مستحکم در نہ پان پہلوی + کسا گیا ہے +
 خواجہ حافظ کے دیوان میں عشق و جوانی اور رندی اور شاہد بازی کے مضامین
 کے سوا جو کہ دنیا میں ہمیشہ مرغوب رہے ہیں اور انسان کے دل کو بزدراپنی طرف
 کھینچتے ہیں۔ اور کوئی مضمون ہی نہ تھا۔ اور اس خیال نے کراس میں عشق کی
 واردات اور کیفیات عشق مجازی کے پیرائے میں ادا کی گئی ہیں اس کو اور بھی زیادہ
 دلچسپ اور دلربا کر دیا تھا۔ پس ان تینوں کتابوں کا اس قدر مقبول ہونا کچھ زیادہ
 تعجب کی بات نہ تھی +

گلستاں میں ان وجہ سے کوئی وجہ نہ تھی نہ اس میں مذمتی نہ عجیب غریب
 افسانے تھے۔ نہ فوق العادہ قصے۔ نہ حقائق و معارف نہ شریعت کے اسرار۔
 نہ طریقت کے نکات۔ نہ غزل عاشقانہ۔ نہ قول عارفانہ بلکہ اس کی بنیاد محض اخلاقی
 بند و موعظت پر رکھی گئی تھی جس سے زیادہ کوئی پھیکا اور بے ناک مضمون خاص کر
 فارسی لٹریچر میں نہیں پایا جاتا۔ بند و موعظت جب تک قصہ یا ناول کے پیرائے میں زادا
 کی جائے۔ اکثر مخاطب کی وحشت اور نفرت کا باعث ہوتی ہے کیونکہ انسان کی طبیعت
 میں یہ بات و دعیت کی گئی ہے کہ وہ کھلی نصیحتوں سے متنفرد چھپی نصیحتوں سے متاثر ہوتا
 ہے۔ پس گلستاں کا اس قدر مقبول ہونا سو اس کے کہ اس کی فصاحت و بلاغت
 اور حسن بیان اور لطیف ادا کو تمام فارسی لٹریچر میں بے مثل اور ملاحجوب کیا جا
 سکے کسی وجہ پر محمول نہیں ہو سکتا +

گلستاں کی عظمت اور بزرگی زیادہ تر اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ جس قدر

عین بانوں کا لباس اس کتاب کو پہنایا گیا ہے ایسا فارسی زبان کی کسی کتاب کو نہیں
 نہیں ہوا۔ خود شیخ ہی کے زمانے میں گلستاں کے اکثر قطعات و ابیات اس قدر مقبول
 اور زبانوں پر جاری ہو گئے تھے کہ اُس زمانے کے فضلا اور ادبا اُس کے اکثر اشعار عربی
 نظم میں ترجمہ کر کے اپنا زیور طبع اور قدرت نظم عربی دکھاتے تھے۔ چنانچہ ادیب علامہ دار فضل اللہ
 بن عبد اللہ شیرازی نے بھی جو کہ شیخ کے اخیر زمانے میں تھا اپنی مشہور تاریخ حصان
 میں گلستاں کے دو قطعوں کا ترجمہ عربی میں نظم کیا ہے جو کتب صہل قطعات کے
 ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

قطعہ سعدی

گلے خوشبو کے در حجام رو رہے	رسید از دست محبوبے پرستم
پرو گفتم کہ مشک یا عیبری	کہ از بوہے دلاویز ترستم
بگفتا من گلے تلخ چہ بودم	ولیکن مژدے بالکل نشستم
جمال ہمنشیں وہ من اثر کرد	و گزند من ہماں خاکم کہ پرستم

ترجمہ عربیہ

اذا هو فی الحمام طین مطہنت	تو کھل من ایدر یکیم ال یدری
فقلت لعل انت مساح و منبر	فانی من کل اخل سکران مستہ
اجاہ ہالی کنت طیناً مسدا للآ	فجالت للورد البجنی بمعصہ
فانک فی خلعتی کمال مہالسی	ولما انا اللز اللبئی کنت فی ید

قطعہ سعدی

گر خرومند و اجلات جفا سے بیند تامل خویش نیاز دود درم نشود
سنگ بد گوہر اگر کاسہ زترین شکست قیمت سنگ نیفزاید و زر کم نشود

ترجمہ عربیہ

ان نال فدا من کالات ال منقصة حاشی لدان یذیب النفس بالضجور
فالتبر من حجو اذ صار منکسرا فالتبر تبر وما یزاد فی الحج

پھر ایک مدت کے بعد تمام گلستاں کا ترجمہ جیسا کہ مشہور ہے عربی زبان میں ہوا۔ جو کئی صدیوں تک عرب، شام، روم اور مصر میں متداول رہا اور حال میں مصر کے ایک ادیب نے جس کا نام جبریل ہے اس کا ایک اور سنایت فصیح عربی ترجمہ نظم کا نظم میں اور نثر کا نثر میں چھپوایا ہے۔ اس کے سوا استنبول کی ترکی میں بھی اس کے متعدد ترجمے سنئے گئے ہیں جن میں سب کے اخیر ترجمہ سلطان عبدالحمید خاں کے بھائی اور ولیمدر شاہ پاشا نے حال ہی میں کیا ہے +

یورپ میں گلستان اور بوستاں کے جس قدر ترجمے ہوئے ہیں ان کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم ہونی مشکل ہے۔ مگر انگلش سائیکلو پیڈیا میں کسی قدر ترجموں اور ادیشیوں کا ذکر کیا گیا ہے جو کشتہ ایک چھپے اور شائع ہوئے اس کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے +

گلستاں کے ترجمے بوستاں کی نسبت بہت زیادہ ہوئے ہیں۔ سب سے پہلے جینیٹین نے اصل گلستان مولا طبعی ترجمے اور کسی قدر حواشی کے اسٹڈم میں چھپوائی۔ پھر ڈورائر نے جو کہ فرانس کی طرف سے اسکندریہ میں کانسٹنٹینا فرینچ میں اس کا ترجمہ کیا جو کشتہ اوہیہ بقم تیرس چھپا۔ اس کے بعد اصل کتاب سے گاؤین نے کشتہ اوہیہ اور سیالیت نے کشتہ اوہیہ ترجمہ کیا۔ یہ دونوں ترجمے بھی فرینچ میں ہوئے تھے۔ جرمن زبان میں اولی آپرس کا

ترجمہ زیادہ مشہور ہے۔ وہ اُس کے دیباچے میں لکھتا ہے کہ اس ترجمے میں ایران کے ایک فاضل سے مدد لی گئی ہے اور یہ بھی لکھتا ہے کہ میرے ترجمے سے پہلے ڈورائے کے پنج ترجمے سے ایک اور ترجمہ جرمنی میں ہو چکا تھا۔ اولی ایریس کا ترجمہ نہایت ذی وقعت ہے اور اس میں جو تصویریں چھاپی گئی ہیں وہ بھی بہت عمدہ ہیں۔ یہ ترجمہ اول مسندۂ اء میں بمقام تسلیس نوگ چھپا تھا۔ اور اسی سال جرمن سے بچ زبان میں ترجمہ ہو کر امسٹرڈم میں چھپا۔ اولی انریس نے بوستاں کا بھی ترجمہ جرمن میں کیا ہے۔ حال میں گلستاں کا ایک اور ترجمہ کے۔ لیج۔ گران نے جرمن میں کیا ہے جو مسندۂ اء میں بمقام تسلیس نوگ چھپا ہے۔ اسی مترجم نے بوستاں کا بھی ترجمہ کیا ہے۔ جس کا نام سنٹ گارٹن ہے۔ اور جو مسندۂ اء میں دو جلدوں میں چھپا ہے۔ انگریزی میں گلستاں کا ترجمہ ایک تو گلیدون نے کیا ہے جو بمقام لندن مسندۂ اء میں چھپا۔ دوسرا ترجمہ اس صاحب کا ہے جو ایشیا ٹک سوسائٹی کے لیے کیا گیا تھا۔ اور ایک ترجمہ آیسٹوک نے انگریزی میں کیا ہے نظم کا نظم میں اور شرکا نہیں جو مسندۂ اء میں بمقام ہرٹ فورڈ چھپا تھا۔ یہ ترجمہ نہایت عمدہ ہے۔ سعدی کے کلیات فارسی و عربی چھوٹی قطع کے کاغذ پر تیسرے نگین نے مسندۂ اء میں چھپوائے تھے۔ اور گلیدون نے صرغ گلستاں مسندۂ اء میں چھپوائی جو دوبارہ مسندۂ اء میں بمقام لندن مطبوع ہوئی۔ پھر مسندۂ اء میں جس ڈیولن نے گلستاں مع اپنے ترجمے کے کھلتے میں چھپوائی۔ جو اُس وقت سے اب تک کئی بار پھر پھر چھپ چکی ہے۔ پرنسیر فاکر نے فارسی خواں طلبا کے لیے بوستاں کا نہایت عمدہ انتخاب کر کے چھپوایا ہے۔ جس میں تقریباً بتائی کتاب داخل ہے۔ اور بعض حکایات کے ترجمے حاشیہ سمیت ایشیا ٹک جرنل میں مع متن کے چھاپے گئے ہیں۔ ٹاکٹر اے اسپرنگ نے مسندۂ اء میں

بمقام کلکتہ گلستاں مع اعواب اور علامات وقف کے چھپوائی تھی۔ اور آسٹوک نے
 بمقام ہرٹ فورڈ سٹیشن اے میں اسکوئی قلمی نسخوں سے صحیح کر کے مع فرہنگ کے شائع کیا۔
 مذکورہ بالا ترجموں اور اڈیشنوں کے سوا جن کا ذکر انگلش سائیکلو پیڈیا میں کیا
 گیا ہے اور بہت سے نئے ترجمے اور اڈیشن خصوصاً سٹیشن اے کے بعد شائع ہوئے ہیں۔
 ازاں جملہ سٹیشن اے میں جان پلیٹ انسپیکٹر ارس ممالک متوسط نے اصل گلستاں
 مع انگریزی فرہنگ کے حسن اہتمام اور صحت کے ساتھ لندن میں چھپوائی تھی۔ اور
 کپتان دبیر فورس کلارک نے بوستاں کا انگریزی ترجمہ سٹیشن اے میں کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ
 یہ ترجمہ اُس نسخے سے کیا گیا ہے جو جرمنی کی اورینٹل سوسائٹی میں سٹیشن اے میں چھاپا تھا
 پھر حال ہی میں بوستاں کی جدید حکایوں کا ترجمہ تھیر میکین نے نظم میں کیا ہے جس کا
 نام فلورڈ فرورم دی بوستاں رکھا ہے۔

ہندوستان میں بھی متعدد زبانوں میں گلستاں کا ترجمہ ہوا ہے۔ از انجملہ میر شیر علی
 افسوس مختص نے مارکوٹس ولنلی گورنر جنرل کے عہد میں اُس کا اردو ترجمہ نظم کا
 نظم اور نشر کا نسخہ لکھا ہے۔ مگر چونکہ اُس وقت تک اردو زبان خوب منجھکر صاف
 نہ ہوئی تھی۔ اس لیے زمانہ حال کے ترجمے جو اُس کے بعد ہوئے ہیں زیادہ صاف اور
 با محاورہ اور فصیح ہیں۔ تنگالی۔ اور گجراتی میں بھی گلستاں کے ترجمے ہوئے ہیں مگر اُن کا
 مفصل حال معلوم نہیں ہے۔ تھاشا میں اول شمال مغربی اضلاع میں گلستاں کے
 افسوس باب کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ جس کی اشاعت کو تقریباً تین برس گزرے ہوئے۔
 اس ترجمے کا نام مترجم نے پشیپو پ باٹکا دینی باغ کی ایک کدھی رکھا ہے۔
 اسکے بعد ہمارے دوست پنڈت مہر چند داس سماجن اگر دال جینی مذہب متوطن تھی

سُونی پت ضلع دہلی نے حال ہی میں ساری گلستاں کا ترجمہ نظم کا نظم میں اور بشر کا بشری نہایت کوشش سے کیا ہے جو مشہور اء میں چھپ کر شائع ہو گیا ہے۔ اس ترجمے کا نام کپشپو پ بن رکھا ہے جو کہ لفظ گلستاں کا مراد ہے پنڈت صاحب نے پنڈتہ شیخ یعنی کرنا کا بھی بھاشا ترجمہ جو بائی وزن کی نظم میں لکھا ہے جبکہ نظم سیکستا پتری ہے۔ ترجموں کے علاوہ گلستاں بلکہ بوستاں کی بھی بہت سی شرحیں اور فرہنگیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں سے خان آرزو کی خیابان گلستاں اور ٹیک چند کی بہار بوستاں زیادہ مشہور ہیں۔ علی الخصوص گلستاں کی قدر و منزلت ہر طبقہ اور ہر درجے کے لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ اور اپنے اپنے خیالات کے موافق کی ہے جس طرح اہل علم نے مختلف زبانوں میں اس کے ترجمے کیے ہیں اور شرحیں وغیرہ لکھی ہیں یا اہل تسلیم نے قادی تعلیم کی بنیاد اس پر رکھی ہے یا منشیوں نے اس کے فقرات و ابیات سے اپنے منشآت کو زینت دی ہے۔ اسی طرح اُمرا نے اس کے نسخے نہایت خوشخط لکھوا لکھوا کر ان کو مُطلے اور نذہب کرایا ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے ملک کے رئیسوں نے بھی جو درجہ کتاب سے کچھ سروکار نہیں رکھتے، اس کی حد سے زیادہ قدر کی ہے۔ بعضوں نے ایک ایک نسخے کی تیاری اور تزئین میں لاکھ لاکھ روپے کے قریب صرف کیا ہے۔ اگرچہ ان باتوں کو کتاب کی اصلی عظمت اور خوبی سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ لیکن گلستاں کی عام قبولیت پر اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ کہ ہندوستان کے رئیس اس کو اس قدر عزیز رکھیں۔ گو تا اپنے گانے پر کبھی ایسا نغمہ نہیں کرتا جیسا اس وقت کرتا ہے کہ ایک نازوں کی مجلس میں جا بٹھنے اور ان کو محظوظ کر کے آٹھے +

گلستاں کے ابواب کی عمدہ ترتیب۔ اس کے فقروں کی جرتگی، اس کے الفاظ کی

مشنگی، اُس کے استعارات کی جزالت، اُس کی تشبیہات و تمثیلات کی طرفگی، اور یہی
 باوجود ان تمام باتوں کے عبارت میں نہایت سادگی اور صفائی اس بات پر دلالت
 کرتی ہے کہ شیخ نے اپنی عمر عزیز کا ایک معتد بہ حصہ اُس کی تصنیف میں صرف کیا تھا۔
 اور اُس کی تفتیح و تہذیب میں اپنے فکر اور سلیقہ سے پورا پورا کام لیا تھا۔ چنانچہ
 دیباچہ گلستاں کے اخیر میں اُس نے صاف کہا ہے کہ ”بچے از عجز گرانمایہ بروخرج کردیم“
 مگر دیباچہ ہی کی ایک اور عبارت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ جس فصل بہار کے آغاز میں
 اُس کا لکھنا شروع ہوا تھا وہ ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ کتاب تمام ہو گئی۔ اور اکثر
 لوگوں کا یہی خیال ہے کہ شیخ نے گلستاں چند مہینے سے زیادہ میں نہیں لکھی۔ مگر یہ
 بالکل غلط ہے۔ جو لوگ تصنیف کے درد سے آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ کلام میں لذت
 اور قبولیت پیدا نہیں ہو سکتی جب تک کہ اُس کے ایک ایک نقطہ میں مصنف کے خونِ طبع
 کی چاشنی نہ ہو اور جس قدر اُس میں زیادہ صفائی اور گھلاوٹ پائی جائے اسی قدر
 سمجھنا چاہیے کہ اُس کی درستی اور کاٹ چھانٹ میں زیادہ دیر لگی ہوگی۔

یورپ میں اکثر نامی مصنفوں کے مسودے ہم پہنچا کر نہایت احتیاط اور حفاظت
 سے رکھے گئے ہیں۔ چنانچہ اٹلی کے شمالی حصے میں جو فریڈرک ایکسٹری ہے وہاں مشہور
 ایپوسیفو کے مسودے اب تک موجود ہیں۔ اُس مصنف کا کلام سادگی اور صفائی
 اور بے تکلفی میں مشہور ہے۔ مگر اُس کے مسودے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو فقرے
 لوگوں کو نہایت پسند آتے ہیں اور حد سے زیادہ صاف ہیں وہ آٹھ آٹھ دفعہ کانٹے
 گئے ہیں۔ لارڈ مکالے جو انگلستان کا نہایت مشہور اور مقبول مصنف ہے اُس کا
 ایک مسودہ لندن میں یوزیم میں رکھا ہے اُس میں جا بجا کاٹ پھانس اور حاک اصلاح

پائی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بعض فقرے دہل دہل گئے ہیں۔ ظاہر ہے
شیخ نے جو گستاخوں کے وہاں سے منسلک ہمارا ذکر کیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ گستاخوں
کے لیے جو سرمایہ اس نے سالہا سال سے جمع کیا تھا وہ پہلے سے اس کے پاس نہ تھا
موجود تھا۔ جب وطن میں پہنچا تو وہ دستوں کی تحریک سے اس کو مرتب کر دیا۔ یہ ترتیب
فصل ہمارے آغاز سے شروع ہوئی اور اس کے تمام ہونے سے پہلے ختم ہو گئی۔

گستاخوں اور فیوض گستاخوں کی ترتیب جس سلیقے سے شیخ نے کی ہے۔ اس سے ثابت
ہوتا ہے کہ اس کو اس کام میں بہت دقت اٹھانی پڑی ہوگی۔ اس نے ان کتابوں
میں زیادہ تردد اوقات لگے ہیں۔ جو خود اس پر گزرے ہیں یا اس کے سامنے پیش
آئے ہیں۔ اور ہر ایک بات کی تکمیل کے لیے کسی قدر حکایتیں ایسی بھی لکھی ہیں جو
کسی سے سنیں یا کتابوں میں پڑھیں۔ اس تمام مجموعے کو گستاخوں میں آٹھ باب
اور کتابوں میں دہل باب پر تقسیم کیا ہے اور ہر ایک باب میں اس کے مناسبت حکایتیں
دیج کی ہیں اور ظاہر علم اخلاق کی کوئی فرع ایسی نہیں ہے جو بقدر ضرورت ان میں سے
ہر ایک کتاب میں بیان کی گئی ہو۔ یہ بات تقریباً ایسی ہی مشکل تھی جیسے کوئی شخص
سیر و سیاحت کے واقعات ایسی ترتیب سے لکھے کہ اس میں علم اخلاق کے ہر ایک باب کا
مطلب اجمالاً یا تفصیلاً بقدر ضرورت آجائے۔ اس ترتیب کی قدر اس وقت معلوم ہوتی
ہے کہ دونوں کتابوں کی اصل حکایتوں کو نامرتب کر کے گڈ بڈ کر دیا جائے۔ اور ہر ایک حکایت
سے جو نتیجہ شیخ نے استخراج کیے ہیں وہ ان میں درج نہ کیے جائیں اور تمام مجموعہ حکایات
لو جہاں کتابوں پر تقسیم کر لیا جائے اور پوچھا جائے کہ وہ حکایت کون سے باب سے علاقہ
رکھتی ہے اور یہ گول سے باب سے ؟

جس طرح ہر ملک میں لٹریچر کی ابتدا انظم سے ہوتی رہی ہے اسی طرح ایران میں بھی لٹریچر شاعری کا طور پورا ہوا تھا۔ اور دوسری صدی کے اخیر سے جب کہ اول ہی اول خواجہ عباس مروزی نے ناموں کی طرح میں فارسی قصیدہ لکھا۔ کئی صدیوں تک مقتضائے وقت کے موافق صرف شاعری کو ترقی ہوتی رہی۔ فارسی نثر لکھنا اگرچہ ایک مدت کے بعد شروع ہو گیا۔ لیکن شیخ کے زمانے تک اُس کی کوئی عام شاہراہ مقرر نہیں ہوئی اکثر سیدھی سادی عبارت عام و بڑھ اور بول چال کے موافق لکھی جاتی تھی یا اہل علم کسی قدر خواص کے روزمرہ میں تحریر کرتے تھے۔ چنانچہ حکیم ناصر خسرو کا سفر نامہ جو کہ پانچویں صدی میں لکھا گیا۔ اُس میں نہایت بے تکلفی سے خواص کی معمولی بول چال میں حالات تحریر کیے گئے ہیں اور بعض ادیب اور فاضل جن پر عزت غالب تھی ان کے قلم سے بغیر فکر اور غور کے اکثر لغات اور اشعار وغیرہ فارسی تحریریں تیار ہوتی کرتے تھے۔ مگر نثر میں شاعرانہ شوخی اور جادو پیدا کرنا اور اُس کے فقرات میں ایک خاص قسم کے وزن اور تول کا لحاظ رکھنا جاری نہوا تھا۔ خصوصاً کوئی اخلاقی کتاب عمدہ نثر میں شیخ کے زمانے تک ایسی نہیں لکھی گئی تھی جس میں اخلاق کا بیان اوقات نفس الامر کے ضمن میں کیا گیا ہو۔ سلسلہ میں قاضی حمید الدین ابو بکر نے مقامات تہذیبی اور مقامات حریری کی طرز پر فارسی میں مقامات حمیدی لکھی ہے۔ اُس میں نہایت تکلف اور تصنع پایا جلتا ہے اُس کی بنیاد زیادہ تر صنائعِ عقلی پر رکھی ہے اور تمام کتاب بدیہی اور حریری کی طرح محققانہ اور مستحکم لکھی ہے اور جس طرح ابن دونوں کتابوں میں فرنی قہتے وضع کیے گئے ہیں اسی طرح اس میں بھی محض خیالی افسانے لکھے ہیں جن میں گھٹانے بڑھانے اور ہر قسم کے تشریف کرنے کا اختیار مصنف کے ہاتھ میں

ہوتا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے کوئی خیال اس کے سوا دل میں پیدا نہیں ہوتا کہ مصنف کو عربی لغات پر بہت عبور تھا۔ اور تہنیں و ترصیع اور دیگر صنائع لفظی کے برتنے پر کافی قدرت رکھتا تھا۔

ایک اور کتاب موسوم بہ قابوس نامہ پانچویں صدی ہجری کی تصنیف ہماری نظر گذری ہے جس کا مصنف قابوش بن سکندر ثقفی بن نصر المغانی ہے یہ نام کتاب اخلاق اور آداب معاشرت میں لکھی گئی ہے اس کا بیان بہت صاف اور سادہ ہے۔ مؤلفین عمدہ ہیں لیکن اس کے سوا کوئی ندرت یا دلفریب اس کی عبارت میں نہیں پائی جاتی۔ غرض کہ شیخ نے آنکھ کھول کر بشر کا کوئی ایسا عمدہ نمونہ نہیں دیکھا تھا جس کی نسبت یہ گمان کیا جائے کہ گلستاں کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہو۔ حق یہ ہے کہ وہ خود ہی اس روش کا موجب تھا اور اسی پر اس کا خاتمہ ہو گیا۔

اس نے اپنی دونوں بے نظیر کتابوں میں برخلاف ایرانی متاثرین کے اپنی بلند پروازی اور نازک خیالی ظاہر کرنی، یا اپنا فلسفہ اور تجربہ علمی جہاننا، یا عقل و عادت کے خلاف باتیں لکھ کر لوگوں کا دل بٹھانا۔ اور عجائبات کا طلسم باندھ کر خلعت کو حیرت میں ڈالنا نہیں چاہا۔ اس نے دونوں کتابوں میں باشتناء و چند حکایتوں کے کوئی موقع ایسا نہیں لکھا جو عقل یا عادت کے خلاف ہو یا جس کو سن کر کچھ زیادہ تعجب ہو۔ اکثر اپنی آنکھ کی دیکھی باتوں سے سنی یا کسی کتاب سے۔ انتخاب کی ہوئی ایسی سیدھی سادی معمولی باتیں لکھتا ہے جو صبح سے شام تک ہر انسان پر گزرتی ہیں۔ عام نکات یا

۱۔ شخص دیا ملے آل زبایں سے ایک باوخواہ ہے جس نے جرجان اور گیلان وغیرہ میں لکھ کر
حکمرانی کی ہے اور سلاطین ہجری میں دفات پائی۔

جوان کتابوں میں درج ہیں وہ اس قبیل کی ہیں کہ مثلاً ایک بر معاش سائل نے اپنے کو قرضہ انظار ہر کر کے ایک بزرگ سے دو دینار حاصل کیے۔ لوگوں نے کہا یہ تو مکار تھا اسکو کچھ دینا نہ چاہیے تھا۔ فرمایا اگر مکار تھا تو میں اس کے شر سے بچاؤں نہ وہ ادرول کے شر سے بچاؤ۔

یابہ کہ ایک بادشاہ زادے کے تلج کا لعل نہیری رات میں ایک پتھری جگہ پر گر پڑا۔ بادشاہ نے بیٹے سے کہا کہ پتھریوں میں سے لعل پانا چاہتا ہے تو ہر پتھری کو لعل سمجھ کر غور سے دیکھ۔

یابہ کہ تین چند درویشوں کے ساتھ روم میں پہنچا اور ہم سب ایک ذی مقدوشخ کے ہاں آئے۔ اُس نے ہماری ہر طرح سے خاطر کی مگر کھانے کو کچھ نہ دیا۔

ان سیدھی سادی حکایتوں کو وہ ایسے لطیف اسلوب سے بیان کرتا ہے اور ان سے ایسے پاکیزہ نتیجے استخراج کرتا ہے کہ ایک نہایت بے حقیقت بات حقیقت میں ایک مکتہ یا ایک دلچسپ قصہ معلوم ہوتا ہے۔

گلستاں اور بوستان کو پڑھ کر دو باتوں میں سے ایک بات کا ضرور اقرار کرنا پڑتا ہے۔ یا تو یہ انتخاب کرنے میں شیخ کا مذاق ایسا صحیح تھا کہ جو حکایت وہ ان کتابوں میں درج کرنی چاہتا تھا۔ اُس میں کوئی نکوئی لطیف اور چمکتی ہوئی بات ضرور ہوتی تھی اور لیکہ وہ اپنی خوش سلیقگی اور حسن بیان سے ایک مبتذل اور بیش پا اتفاقہ مضمون کو بھی اُسی قدر دلانیز طور پر بیان کر سکتا تھا جیسے ایک نرالے اور انجوتے خیال کو۔

تغجب ہے کہ شیخ کی گلستاں جو آئندہ نسلوں کے لئے نثر فارسی کا ایک لاجواب نمونہ تھی ایران میں اُس کے متبع کا کسی نے خیال نہیں کیا۔ یا یوں کہئے کہ کسی سے اُس کا

تبیع نہیں ہو سکا۔ اگرچہ شیخ کے بعد شرفا سی کی ترقی یا وسعت انتہا کے درجے کو پہنچ گئی اور شریکین پر ایسے ایسے جلیل القدر فاضلوں نے کربا مذہبی جن کا علم و فضل شیخ سے برابر فائق تر تھا مگر سب کی ہمت زیادہ تر الفاظ اور صنائع لفظی پر مقصور رہی +

ایران میں سب سے بڑا اثنا فضل الشہر بن عبداللہ شیرازی سمجھا جاتا ہے جو شیخ کے اخیر زمانے میں ہوا ہے اس کی مشہور کتاب تاریخ و صفات سے بے شک اس کا کمال علمی اور عربی و فارسی دونوں زبانوں کی نظم و نثر پر بڑی قدرت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ساری کتاب میں شاید ہی کوئی فقرہ ایسا ملے جو متوسط درجے کی استعداد کا آدمی ڈاکٹری کھولے بغیر سمجھ سکے یا جس کا انداز بیان دل میں جا کر کچھے۔ سائنس و عربی میں جب کہ سلطان محمد اولجا تو قلاں خدا بندہ کے حکم سے آذربایجان میں شہر سلطانینہ بنکرتیار ہو چکا اور اس خوشی میں سلطان کی طرف سے تمام شہر کی دعوت کی گئی۔ اس تہنیت میں فضل اللہ بھی موجود تھا اور اسی زمانے میں اس نے تاریخ و صفات ختم کی تھی۔ اس کتاب کی تقریباً اور کوریف سلطان کے حضور میں کی گئی۔ سلطان نے اس میں سے کچھ متفرق فقرے پڑھنے کا حکم دیا۔ اس وقت دربار میں وزیر رشید الدین اور قاضی القضاۃ نظام الدین عبدالملک اور خواجہ صیل الدین طوسی اور بڑے بڑے عالم اور فاضل موجود تھے۔ فضل اللہ نے چند دعائیہ فقرے کہ ان سے مزادہ سلیس اور آسان عبارت شاید تمام کتاب میں نہ ہوگی، خاص سلطان کے سنانے کو لکھے تھے وہ پڑھنے شروع کیے۔ سلطان ہر فقرے کے معنی رشید الدین غلام سے پوچھتا تھا۔ یہ لوگ اس کی شرح بہت بسط کے ساتھ کرتے تھے تب سلطان کی سمجھ میں کچھ آتا تھا یا شرمے خرمائے کچھ ہاں ہوں کر دیتا تھا۔ یہ حال تاریخ و صفات کی

عبارت کا ہے۔ اُس کے بعد بھی زیادہ تر نثر لکھنے والوں نے اسی بات میں شوشن کی ہے کہ اُن کی نثر کے سمجھنے میں ناظرین کو طرح طرح کی دقتیں پیش آئیں اور اُنکے علم و فضل اور سمجھ و ادنیٰ کا اعتقاد دلوں میں پیدا ہو۔ مگر تیار اور بہت کم کیا گیا ہے کہ مضید خیالات زود و نرم الفاظ اور دلاویز عبارت میں ادا کیے جائیں *

تین کتابیں میری حشر سے گزری ہیں جو شیعہ کے بعد گلستاں کی طرز پر لکھی گئی ہیں۔ ایک مولانا عبد الرحمن جامی کی بہارِ ستاں۔ دوسری محمد الدین خوانی کی خارستان۔ تیسری حبیب قاضی شیرازی کی پریشان۔ سواول ہم بہارستان کا ذکر کرتے ہیں۔ اگرچہ خارستان کو عبارت کی خوبی اور جزالت کے لحاظ سے بہارستان کے ساتھ کچھ نسبت نہیں ہے۔ بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو، تو خارستان کا طریقہ تحریر اکثر جگہ اہل زبان کی روش سے بیگانہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جب دونوں کو گلستاں کے مقابلے میں لایا جاتا ہے تو جس طرح آفتاب کے سامنے چاند اور سترح دونوں کی روشنی کا فور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بہارستان اور خارستان دونوں کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے اور ایک دوسرے سے بہتر کہنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔

حکایتیں اور روایتیں جو ان کتابوں میں دیج کی گئی ہیں وہ فی الحقیقت گلستاں کی حکایتوں سے بہت ہلکی جلتی ہیں اور دیکھ کر محمد الدین خوانی نے اپنی کتاب کے ابواب بھی اسی طرح پر مرتب کیے ہیں مگر شیخ کے حسن بیاں اور لطیف اداسے

یہ شخص اگر کہ محمد بن خراسان سے آیا تھا۔ خوان خراسان میں ایک شہر رہتی ہے۔ کہتے ہیں کہ خارستان اس نے لکھے مگر سے کھلی تھی *

یہ شخص زمانہ مال کا ایک نہایت مسلم اور مقبول شاعر ہے جس کو اہل ایران قاتم اشعار سمجھتے ہیں اس کی وفات کو چالیس برس سے زیادہ نہیں گزرے *

گلستاں نے ایک خاص صورت پیدا کی ہے جس کے سبب سے وہ بالکل انوکھی اور نرالی چیز معلوم ہوتی ہے۔ ہر چند اس قسم کی ہم شکل اور مجنسن کتابوں میں پانچواں فرق اور امتیاز کرنا بغیر وجدان صحیح اور ذوق سلیم کے ممکن نہیں ہے۔ لیکن چند تعدد الخلق فقرہوں کے مقابلہ کرنے سے کسی نہ کسی قدر اندازہ ہو سکتا ہے کہ کون سا اسلوب بیان زیادہ صاف اور پاکیزہ و دلکش ہے اور کون سا کم۔ اس لیے چند ایک ایسی مثالیں جو نہایت دقت اور جھجھک سے ہم پہنچی ہیں، اس مقام پر نقل کی جاتی ہیں :

گلستان اور بہارستاں کا مقابلہ

گلستاں - اسکندر سپہر سید ملک دیار شرق بھارستاں - اسکندر راگفتند
 و مغرب را بچہ گرفتگی کہ ملک پیشین را خراش و بچہ سبب یافتی آن چہ یافتی از دولت
 عمرو ملک و لشکر پیش از تو بودہ چنین فتحیستہ سلطنت و مملکت با صغیر سن
 نشدہ گفت برون غلے تو دجل پر ملتے را کہ حد اثب عمدہ گفت براستہ است
 اگر قسم رعیتش - اینا ز روم و روم غیر گیتی شد گاہ دشمنان تا از غائلہ دشمنی زمام
 باطل نہ کوم و نام بادشاہان جز بہ کوئی بیزمیت یافتند و از تعاہد دوستان تا در
 بزرگش نخواہند اہل حرد قاعدہ دوستی استحکام یافتند

بیت

باید ملک سکندر چوں فے ازین سپہ
 دشمنان را دوست گردان وستان را دوست

کہ نام زندگان بزدستی بزد قطعہ
 این مہیج است چوں سے بگذرد
 بہت و سخت و آخر دینی و گروہ
 نام نیاب رنگاں ضلع سخن
 تا بماند نام فیکت پائدار

ان دونوں عبارتوں میں باعتبار فصاحت و بلاغت کے جو فرق ہے اُس کا فیصلہ زیادہ تر ذوقِ صحیح پر منحصر ہے مگر جس قدر قید بیان میں آسکتا ہے وہ لکھا جاتا ہے۔ لیکن اِس سے محض گستاخ کی فوقیت جتنی مقصود ہے نہ کہ ہمارے ستان کی تنقیص کرنی:-

۱۔ اول ”اسکندر را پرسیدند“ اور ”اسکندر را گفتند“ میں جو فرق ہے وہ ظاہر ہے سوال کے موقع پر پرسیدن بہ نسبت گفتن کے زیادہ مناسب ہے +

دوسرے شیخ کے ہاں خزائن و عمر و ملک و لشکر چار لفظ ایک دوسرے پر مطبوع ہیں اور کوئی لفظ حشو و بیکار نہیں ہے اور مولانا کے ہاں دولت سے اگر سلطنت مراد ہے تو سلطنت و مملکت دونوں در نہ صرف لفظِ مملکت حشو ہے اور صغریٰ کے بعد حدیثِ عمد بھی حشو ہے +

تیسرے شیخ کے ہاں بیاں میں سوال کرنے کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ باوجود کہ لشکر و عمر و مال کے مشرق و مغرب کو فتح کرنا تعجب سے خالی نہ تھا۔ اور مولانا کے ہاں سوال کی ایسی وجہ ظاہر نہیں ہے کیونکہ تھوڑی سی عمر میں بہتیرے لوگوں نے دولت اور سلطنت حاصل کی ہے +

چوتھے اسکندر کا جواب جو شیخ نے نقل کیا ہے اس میں ہرگز اس سے زیادہ مختار کی گنجائش نہ تھی ورنہ اسکندر کا جواب نامتو رہتا۔ اور جو مولانا نے نقل کیا ہے وہ ان لفظوں میں ادا ہو سکتا تھا ”یا ستمانیہ دشمنان و معاہدہ و ستان“ اس سے زیادہ بیان کرنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی +

پانچویں شیخ نے جو نتیجہ حکایت کے ضمن میں سے نکال کر اشار میں بیان کیا ہے وہ

کئی وجہ سے مولانا کے نتیجے کی نسبت زیادہ پہنچ ہے۔ شیخ کا نتیجہ لازمی ہے اور مولانا کا نتیجہ غیر لازمی کیونکہ یہ ضرور نہیں ہے کہ جو شخص دشمنوں کو دوست اور دوستوں کو زیادہ دوست بنالیا گیا۔ اُس کو ضرور سکندر کی سی سلطنت حاصل ہو جائیگی۔ اس کے سوا مولانا کا حقیقت میں کوئی نتیجہ نہیں نکالا بلکہ حکایت کا خلاصہ ایک بیت میں دوبارہ بیان کر دیا ہے۔ اور شیخ نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ ایک اچھوتا مضمون ہے کہ جب تک بیان نہ کیا جاسکے ہر شخص کا ذہن وہاں تک انتقال نہیں کر سکتا۔ نیز شیخ نے ایسا حادی نتیجہ نکالا ہے جو تمام مخلوق کو شامل ہے۔ کیونکہ سلف کی تعظیم اور ادب اور اُن کے محاسن و کمالات کی قدر کرنی ہر شخص کے حق میں بھر بھرتا ہے اور مولانا کا نتیجہ **مکالمات** اولین اولو الہوم کے ساتھ مخصوص ہے کیونکہ مکالمہ سکندر کی خویش اُن کے سوا اور کسی کو نہیں ہوتی + گلسٹا۔ رائے کہ نہاں خواہی با کس سبباں بہار و سبباں۔ اسرار نہاں خود را با هیچ دوستے منہ اگرچہ دوست باشد کہ راں دوست را نیز دریاں منہ دیرا کہ بسیار بود کہ در دوستی مثل دوستاں باشند و چنین مسلسل قطعہ

خاموشی بہ کہ خمیسیر دل خویش
با کسے گفتن و گفتن کہ کوئے
لے سلیم آب ز سر چشمہ بہ بند
کہ چو نثر شد متوال بہ تن جوئے

افتد و بہ دشمنی بدل گردد قطعہ
لے پسر ہے کس از دشمن بہ گفتن اور تم
یہ کہ از افشاے آں باز دستہ کہ نہ از
دیدہ ام بسیار کہ میر بہر کج نہاد
دوستاں و دشمن شوند و دوستی ما دشمنی

بیت

سخنے در حسن بنا یاد گفت
کاں سخن بر طافشا یاد گفت

دیر میر بہر کج کہ افتد بہ بنا یاد
سخت کمر بہر کج کہ افتد بہ بنا
ترزم شود عرا مت افشا بر آں ترا
مشکل تر از مرا مت پریشدہ و دشمنی

اس مثال میں بھی گلستاں کا بیان بہارستان کی نسبت چند وجود سے زیادہ بلند ہے۔ ۱۔ شیخ کہتا ہے ”رازے کہ مناس خواہی“ یعنی جس بھید کو چھپانا منظور ہو اسے کسی سے نہ کہو۔ اور مولانا کہتے ہیں ”اسرار نہانی خود را علیٰ معنی اپنے پوشیدہ بھیدوں کو ظاہر نہ کرو۔ حالانکہ بعضے بھید کیسے ہی پوشیدہ ہوں ایک مدت کے بعد کہنے کے لائق ہو جاتے ہیں مگر جن کا چھپانا منظور ہوتا ہے وہ کبھی کہنے کے لائق نہیں ہوتے۔ ۲۔ شیخ کہتا ہے ”باکس دریاں منہ اگر دست باشد“۔ اور مولانا کہتے ہیں ”باہیچ دوستے دریاں منہ“ پہلے بیان میں دوست اور بغیر دوست سب سے راز کہنے کی ممانعت ہے۔ مگر دوسرا بیان جب تک اس طرح نہ ہو ”باہیچ دوست ہو“ دوسرا بیان اس کے ”حب تک اس میں تقسیم پیدا نہیں ہوتی۔ ۳۔ شیخ نے راز نہ کہنے کی وجہ بیان کی ہے کہ اس کے بھی دوست ہونگے اور ان کے دوستوں کے بھی دوست ہونگے اور یہ سلسلہ ای جھجکا جائیگا پس چھپکے ہی چھپکے راز چھپوں میں بھیل جائیگا۔ بلانا انے یہ وجہ بیان کی ہے کہ شائد دوستی میں غفل آجائے اور دوست دشمن ہو جائے۔ اگرچہ مطلب دونوں صحیح ہیں لیکن پہلی وجہ زیادہ مؤثر ہے کیونکہ یقیناً کوئی شخص دوستوں سے غالی نہیں ہوتا اور دوستی میں فرق آجاتا کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا ۴۔ شیخ کا قطعہ بلاغت میں مولانا کے قطعہ سے ہر اعتبار میں اور فائق تر ہے پہلی بیت میں اس نے انسان کی ایک ایسی فاضل اور دقیق خصلت کی طرف اشارہ کیا ہے جو عام نظروں سے مخفی نہیں ہے وہ کہتا ہے

خاموشی بہ کہ صبر دل خویش باکسے گفتن و گفتن کہ گوے

یعنی کسی سے اپنا بھید کہہ کر اس کو افشائے راز سے منع کرنا کچھ مفید نہیں ہے کیونکہ انسان بخشنا بر زیادہ عرض ہوتا ہے اس لیے اب اس کو ضبط راز کرنا اور بھی مشکل ہوگا۔ پس اس سے خاموشی ہی بہتر ہے۔ دوسری بیت میں ایک نہایت لطیف اور دقیق مثال سے مطلب کو

خطر خواہ و لاشیں کیا ہے۔ مولانا کے قلم میں کوئی خوبی اس مضمون کے سوا نہیں ہے کہ جو راز دشمن سے چھپانا چاہیے اسے دوست سے بھی چھپانا چاہیے۔ مگر اس کے ساتھ لفظ آفتاب و اید معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ ازل و ازل و مرنی کی جگہ در آفتاب سے اس دم نرنی لگا گیا ہے۔ اور قلم کا اخیر مصرع بھی حشو یا بکرا سے خالی نہیں ہے۔ دوستوں کا دشمن ہو جانا اور دوستی کا دشمن ہو جانا فی الحقیقت ایک ہی بات ہے۔ ہ۔ قلم کے بعد شیخ نے ایک فرد لکھی ہے جو فی الواقعہ سہل و مقنع ہے یعنی۔

سنئے در مسئلہ نیا یہ گفت کاں سخن بر ملا نشاید گفت

یہ دھوکا اکثر اشخاص کو ہو جاتا ہے کہ جب محبت میں کوئی غیر جنس نہیں ہوتا۔ تو ناگفتنی نہیں کہنے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم تجھے میں یہ گھٹکر کر رہے ہیں اس سے اختیار مطلع نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ وہ باتیں غرور و فخر و متکبر ہو جاتی ہیں۔ اس سے مجرب اور سچے مضمون کو جو کتنی دقیق بھی تھا ایسے صاف طور سے بیان کیا ہے کہ اس سے زیادہ بیان کی صفائی ممکن نہیں پھر قلم اور قلم اور دراز کا مقابلہ اور صفت و ذوق فیتین اس کے علاوہ ہے۔ مولانا نے کوئی فرو نہیں لکھی۔ مگر ایک دوسرا قلم لکھا ہے یعنی مہر پر سر پر نمبر کہ اُفتد بجا طرے الخ۔

اس میں پہلے مصرعہ سے یہ مضمون ہوتا ہے کہ جو راز سر بہتہ تیرے خیال یا دل میں گزرتا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو بھید تیرے دل میں موجود یا مستور ہو۔ پھر مجموعہ بیانش نگاشتین کا لفظ ”دور اعلیٰ آں“ کی جگہ لایا گیا ہے جس میں ضابطہ تکلف ہے۔ پھر اخیر مصرع میں مذمت کا لفظ شاید بے محل ہے کیونکہ اخفا کے راز سے کبھی مذمت نہیں ہوتی۔ باوجود ان تمام باتوں کے دونوں شالوں میں شیخ کے ہاں کوئی لفظ غریب یا غیر مانوس نہیں معلوم ہوتا۔ اور مولانا کے ہاں اکثر افلاک بمقابہ گستاخ کے الفاظ کے غریب معلوم

ہوتے ہیں جیسے قداشبہ عمدہ - غائلہ - تعابد - ہوج بیان نش و عاشق - عزامت ۛ

گلستاں اور خارستاں کا مقابلہ

گلستاں - چکماں دید ویر خورد عابد
 نیم سیر و زاہاں تا سدرق پوناں
 تا طبق برگیرند و پیراں تا سق کشند
 آتا فلسند راں چنداں خورد کرد
 سحرہ جاسے نفس نمائند و بر سفرہ
 روزئی کس -

خارستاں - ہر کہ در گرنگی طاقت نیار
 باید کہ سہ یک شکم را از طعام پر کند و سہ یک گیرد
 آب دسہ یک گیرد از برے نفس زون ما کند
 اما صوفیان وقت مامیگویند کہ تو ہمہ شکم را از
 طعام پر کن - آب خود چیر لطیف است خود را
 چاہے می کند کہ لطیفاں را جاے کم نباشد
 و نفس را جاے کو مباحش بیت

بشنو چہ گفت صوفی برداری
 جوان سیر شدی چراغ جبار داردا
 خارستاں - علم با علم ہوج طعام با نگاہ
 ہر کہ را ہر وہ ہست حکمت تمام وارو - و طعام
 بے نمک را چہ توان کہ بیت

علم بے علم نامضبوط باشد
 ہمیشہ سحر با مشروط باشد

مذکورہ بالا مثالوں کو دیکھ کر غالباً ہر شخص جو فارسی زبان سے فی الجملہ آشنا ہے بخوبی اندازہ کر سکتا ہے کہ خارستاں کی عبارت گلستاں کے مقابلے میں کس قدر کم وزن اور

بیت
 اسیر بند شکم را دشب نگیرد خواب
 شب ز سحرہ منگی شبے زد تشنگی
 گلستاں - عالم ناپیر میگرد کو مشعلہ دار
 بختی بہ و ہو کا یعتدی
 بیت

بے فائدہ ہر کہ عسر در باخت
 چیرے نہ خرید و زربینداخت

بے وقعت ہے اسی لیے ہم اس مقام کو ناظرین کے مذاق اور تیز پر چھوڑ دیتے ہیں اور زیادہ نکتہ چینی کرنے کی ضرورت نہیں دیکھتے۔

پرمیشان کا محضفت خزا عجیب قآنی کتاب مذکور کے غائے کے اشعار میں قمریج کرتا ہے کہ اُس کی عمر تین برس سے بھی دو تین برس کم تھی، جب یہ کتاب اُس نے لکھی ہے اور شیخ نے گلستاں کو سن کہولت اور اوائل سن شیخوخت میں مرتب کیا ہے۔ بس اگر قآنی سے گلستاں کا پورا پورا متبع نہ ہو سکا تو کچھ تعجب نہیں، کیونکہ ایک ایسی کتاب کا سراخام کرنا جس کی بنا محض حکمت اور تجربت پر ہونی چاہیے شیخ کے مقابلے میں ایک نوجوان نابجربہ کار کی طاقت سے باہر تھا۔ بلکہ اگر میری رائے غلط نہ ہو تو بڑی عمر میں قآنی سے گلستاں کا جواب اتنا بھی لکھا جانا مشکل تھا۔ کیونکہ اُس کی تمام عمر قصیدہ گوئی میں صرف ہوئی ہے جس میں محض خیالی ڈھکوسلے باہر تھے اور اظافہ تراشنے کے سوا حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں ہوتی۔ پس جس قدر قصیدہ گوئی میں اُس کو مشق و مہارت زیادہ بڑھتی جاتی تھی اُسی قدر بیان حقائق اور واقعہ نگاری کا نکتہ اُس سے سلب ہوتا جاتا تھا +

قآنی نے بھی گلستاں کی طرح پرمیشاں کی عبارت دلچسپ اور دلادیز کرنے میں بہت کوشش کی ہے مگر سو اس کے کہ تمام کتاب کو بزل اور غرض سے بھر دیا اور چند کنوا اور بے باک نوجوانوں کی ضیافت طبع کا سامان مہیا کر دیا۔ اور کچھ اُس سے نہیں ہو سکا۔ خاتمہ کتاب کے سوا جس میں اُس نے اپنا سہ لکوک کے لیے پند پند کر کے کچھ نصیحتیں لکھی ہیں۔ تمام کتاب میں وہ حکایتوں کی بنیاد اکابر نہایت غلیظ سخن باخف بزل پر رکھتا ہے جس کے بڑھنے سے غم آتی ہے اور طرہ یہ کہ پھر اُس سے

تبیح عارفانہ اور مصوفانہ استخراج کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ پریشاں کا خاتمہ میں
شوقی و ظرافت کا کچھ سامان نہیں ہے۔ باب ششم گلستاں کے مقابلے میں نہایت
پھیکا اور بے مزہ معلوم ہوتا ہے۔ تمام خاتمے میں شاد و نا دی کوئی مضمون ایسا ہو گا۔
جس میں کوئی ندرت پائی جائے۔ عبارت بیشک عمدہ ہے مگر شیخ کی مادہ و بیانی کا نشان
نہیں پایا جاتا۔ عام نضایح جو خاتمے میں درج ہیں وہ اس قلیل کی ہیں۔

پند بادشاہ باید سخن چیناں اعتماد کند۔ پند بادشاہ باید دریں راتو قیر کند
و دشمنان دیں را تحقیر فرماید۔ پند بادشاہ باید از خدا غافل ماند تا خداے از و غافل
نباشد۔ پند بادشاہاں را در نظام مالکست در افشاں بکارست و تیغ سرفشاں بیت
تاکدیاں و دستاں شوند فرامی تاکہ بدیں دشمنان شوند پریشاں
اور اگر کہیں عبارت میں اس سے زیادہ حسن پیدا کرنا چاہتا ہے وہاں محبت سے
دور جا پڑتا ہے۔ مثلاً پند بادشاہ باید تو اضع کند و کبر نفراید کہ تو اضع صفت انقیاست
و کبر صفت اشتیاد من گفتہ ام اہل کبر را در لطفہ عش است چہ سر کشی صفت آتش است
و شیطان از آتش است اہل تو اضع را لطفہ پاک است چہ افتادگی صفت خل
است و آدم از خاک بود +

اس بند کے پہلے حصے میں ظاہر ہے کہ کوئی اچھوتا مضمون نہیں ہے اور دوسرے
حصے میں جو اس نے ندرت پیدا کرنی چاہی ہے وہ محض ایک شاعرانہ خیال ہے اور وہ بھی اچھی طرح
بیان نہیں ہو سکا۔ اسی مضمون کو شیخ علیہ الرحمۃ نے بوتاں میں اس طرح بیان کیا ہے :-

ز خاک آنسہ ریت خدا و بے پاک پس لے بندہ افتادگی کہیں چہ خاک
حریم و جہاں سوز و سرکش بائش دغا کہ آفریدند آتش سہا ش

چو گردن کشید آتش ہولناک بیچارگی تن بیداشت خاک
 چو آں سرسرازی نمود ایں کمی ازاں دیو کردند ازیں آدمی
 آلبتہ جو عذر کر تا آئی نے پریشاں کے دیا ہے میں کیا ہے اور گلستاں کے مقابلہ
 میں کتاب لکھنے سے اپنا عذر ظاہر کیا ہے اُس سے اُس کا نہایت انصاف اور گلستاں کی
 قدر شناسی ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے اجاب کے نہایت سخت جبر سے
 پریشاں کے لکھنے پر قلم اٹھایا تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ ”ایک نہایت عزیز دوست نے اصرار
 کیا کہ گلستاں کی ہر زبردست نظم و نثر میں ایک کتاب لکھنی چاہیے۔ میں نے کہا۔ بھائی تو بہ کر!
 میں! اور شیخ کی طرز پر کتاب لکھنے کا ارادہ کروں؟ میں نے نبوت کا دعویٰ کر کے کتاب کے سوا
 اور کچھ خطاب نہیں پایا۔ میں نے مانا کہ نگہنورات کو چلتا ہے لیکن کیا وہ چاند کی برابری کر سکتا
 ہے؟ شیخ کی گلستاں ایک باغ ہے جس کے ہر پھول کی پتی کے ہزاروں بہشت غلام ہیں
 اور اہل ہمنی کی جان قیامت تک اُس کی حیات بخش خوشبو سے زندہ ہے۔ آخر حیاتِ شاخ
 نہانا اور میرے انکار سے اُس کا اصرار بڑھتا گیا تو مجھ کو کچھ نظم و نثر اور جلد و ہزل ترتیب
 دی گئی۔ اور یہ سمجھا گیا کہ اگرچہ چڑیا پروانہ میں شہبازی کی برابری نہیں کر سکتی لیکن اُس کو
 بھی چارونچا پار اڑنا ہی پڑتا ہے۔“
 اب ہم چند ایسے فقرے گلستاں اور پریشاں سے انتخاب کر کے لکھتے ہیں جو متحدہ المصنوع میں

گلستاں اور پریشاں کا مقابلہ

گلستاں۔ اے دزدِ دخل آہِ بوانِ ست پریشاں۔ نخلِ حشرِ ستِ مخرجِ جو حشرِ ست
 خراجِ آسیاے گرواں یعنی خراجِ قرواں کو دینا کآبِ حشرِ ستِ درانہا ہاری ست۔ دلاشک چوں

کے راست کہ دخلے سعتین دارو۔

قطعه

جو دخلت نیست خرج آہستہ ترکن
کہے گویند لقا ماں سرودے
اگر باراں ہو کوہستان بارو
ہلے وجہ گرد و خشک رودے

سرچہ مسدود شود جو نہا خشک شود پس ہرکس
آب و جو جاری خواہد سرچہ را رعایت کند
ایضا خج بانداۃ دخل باید کرد تا نگہ خج معلوم
باشند و دخل موہوم چہ این معنی بنائے مقول
است کہ بار در پیش قدم و بار گیر و تیر عدم شدہ
قطعه۔ الا اے انکہ خرجت بہت ہو جو
بکارت سے نیاید دخل معلوم
شنیدستی کسے از بہر حلال
نشنید بر فراز اسب موہوم

اس مثال میں گلستاں سے صرف ایک عبارت اور پریشیاں کے دو مختلف مقامات
دو عبارتیں ایک ہی مضمون کی نقل کی گئی ہیں مگر شیخ کا بیان محاسنی کی دونوں
عبارتوں سے زیادہ بلند ہے۔ لیکن جو فرق بہت باریک اور نازک ہیں ان کا بیان کرنا
اول تو مشکل ہے۔ دوسرے یہ امید نہیں کہ ناظرین اس کو غور سے دیکھیں گے۔ اسی لیے
صرف ایسے فرق بتائے جاتے ہیں جو زیادہ روشن اور صاف ہیں شیخ کے بیان میں محاسنی
کو فرزند کے ساتھ تعبیر کرنا عین مقلعنا کے مقام ہے۔ ایک تو اظہار شفقت جو ناصح کے لیے
ضرور ہے۔ دوسرے یہ جتنا کہ نوجوان ہی اکثر اس نصیحت کے محتاج ہوتے ہیں۔ پھر دخل
و پنچ کی تشبیہ آب و روں اور پنچ کی کے ساتھ کیسی عمدہ تشبیہ ہے کہ جس قدر زالی ہے اسی
قدر چچی ٹلی بھی ہے۔ پنچ کی بھی بدرون آب و روں کے نہیں چلتی اور پنچ بھی بغیر آمدنی کے
نہیں چلتا۔ پنچ کی پانی کے بند ہو جانے پر کسی عارضی قوت سے نہیں چلائی جاتی ہے۔

تو اس کی گردن عارضی اور بے ثبات ہوتی ہے۔ خراج بھی جو بدون آمدنی کے اندر وغیرہ سے چلتا ہے بے بنیاد اور ناپائدار ہوتا ہے۔ پھر اس تمام مطلب کو جو کہ ہم نے تشبیہ کے معنی سمجھنے کے لیے لکھا ہے شیخ نے ان مختصر اور جامع لفظوں میں ادا کیا ہے یعنی خراج فواہاں کردن مسلم کسے راست کہ دخلے معین دارہ اس کے بعد قطعہ میں ایک نہایت برہمی مثال دیکر بے بنیاد خراج کا مال ہر شخص کو آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا ہے اور اس مقولے کو ملاحوں کی طرف منسوب کر کے یہ بتایا ہے کہ یہ ایسی برہمی بات ہے کہ دجلے کے کنارے پر ہمیشہ ملاحق گیتوں میں گائی جاتی ہے +

قائنی نے آمدنی کو منہج سے اور اخراجات کو نذیوں سے تشبیہ دی ہے۔ تشبیہ یہ بھی عمدہ ہے۔ مگر شیخ کی اس تمثیل سے ماخوذ ہے جو اس نے قطعہ میں بیان کی ہے۔ لیکن چونکہ یہ تمثیل نہایت سوتی اور معمولی تھی اس لیے شیخ نے اس کو ملاحوں کی طرف منسوب کیا ہے اور قائنی کو یہ بات نہیں سوجھی۔ پھر قائنی کے بیان سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ حشریہ کے بندہ ہوتے ہی نذیاں خشک ہو جاتی ہیں۔ اور شیخ کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی قدر مدت کے بعد خشک ہوتی ہیں اور فی الواقعہ ایسا ہی ہوتا ہے، جیسا کہ شیخ نے لکھا ہے۔ پھر شیخ نے منہج کے بندہ ہو جانے کو قدرتی اسباب یعنی اساک باران کی طرف مستند کیا ہے اور یہ کہ اسے وہ اگر باران ہو کہ ہستال نہ بار دے اور قائنی کہتا ہے جو شخص نڈی جاری رکھنی چاہے وہ سر حشریہ کی خبر رکھے یعنی اس کو بند نہ ہونے دے مالاںکہ یہ امر افسان کی طاقت سے باہر ہے۔ پھر قائنی نے تمثیل سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو شخص نڈی کا باری رکھنا چاہے وہ سر حشریہ کی خبر رکھے اگرچہ مطلب اس سے بھی مفہوم ہو جاتا ہے لیکن بس جگہ مقتضائے مقام کے موافق اس کو یہ کہنا چاہیے تھا کہ جو شخص ہمیشہ اپنا خرچ جاری

رکھنا چاہیے اُس کو آمدنی پر نظر رکھنی چاہیے کیونکہ تمثیل ایسی مطلب کے سمجھانے کو دی گئی ہے نہ اس بات کے سمجھانے کو کہ اگر آمدنی میں پانی جاری رہنا چاہو تو سرسبز پنہ کی خبر رکھو۔ دوسری عبارت کو قاف آئی نے اس جملے سے شروع کیا ہے ”خجج باندا ز دُ دخل باید کرد آگے بعد وہ کہتا ہے ”نہ آنکھ خجج معلوم باشد و دخل موہوم“ یہ دوسرا جملہ اُس نے مقتضائے مقام کے موافق نہیں بلکہ اپنی حالت کے موافق لکھا ہے۔ کیونکہ سنایا گیا ہے کہ وہ اکثر جنس و عید وغیرہ کے موقعوں پر دخل موہوم یعنی قصائد کے صلی کی توقع پر قرض لیکر خجج کر لیا کرتا تھا ورنہ مقتضائے مقام یہ ہونا چاہیے تھا ”نہ آنکھ دخل اندک باشد و خجج بسیار“ یا ”دخل خجج باشد و خجج وہ“ یا اسی مضمون کا کوئی جملہ ہوتا کیونکہ آمدنی کے موافق خجج کرنے کا مہوم مخالفت یہی مضمون ہو سکتا ہے اس کے سوا وہ مضمون فی نفسه صحیح بھی نہیں ہے۔ کیونکہ دخل موہوم کی اُمید پر خجج کرنا خاص خاص صورتوں کے سوا کسی کے نزدیک مذموم نہیں ہے۔ تمام تاجرا و کاشتکار اور زمینداران ملک دخل موہوم ہی کے بھر دے پر لکھو کھاؤ خجج کرتے ہیں۔ پھر ایسے خجج کو جو دخل موہوم کی اُمید پر کیا جائے موہوم یا معدوم گھوڑے پر سوار ہونے سے کچھ سناست نہیں معلوم ہوتی۔ معدوم گھوڑے پر بیٹھ کر کوئی سوار نہیں ہو سکتا۔ لیکن دخل موہوم کی اُمید پر جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔ ہزاروں آدمی خجج کر سکتے اور کرتے ہیں *

پویشیاں - کسانیکہ ظرافت و غوغا بایکند
گلستاں خشم پیش ز حد ز رفتن و خشت
یا بغایت رفیق القلب سبع الخلق باشد دریا
و لطف بے وقت و بیت ہر دامن چمن دریا
و سالاری لشکر انشا بند چہ این صفت جوید
دُ رشتی کن کہ از تو سیر گردند و نہ چندان
جبارت لشکریاں شود دگاہ باشد کہ ہرچہ گوید
نرمی کہ بر تو دلیر۔

ابیات

در شتی و زمی بهم در است
چو رگ زن کہ جراح و مریم است
در شتی نگیسر و خرد مندیش
نہستی کہ نائل کند قدر خویش

نظم

جوانے با پدر گفت اے خردمند
ما تسلیم کن پیرانہ یک چند
بگفتا نیک مردی کن نہ چنڈاں
کہ گرد و چسبہ لگ تیز و ناں

بہ ظرافت و خوبی حل کنند و تیر اندک مہربانی و
و مسرت خلق لازم است کہ لشکر این اہم شستن
بستن نباشد و دوریت کہ از بیم چشم و گوش و
نہمت بادشاہ فراموش کنند و دنیا لغت ہر با
شوند و وقت کا سستی کنند تا کا فراسد شود و مٹوئی

کے را کہ شد حکمران ہر سپاہ
و و خصلت ہمیدہ اشت باینہ گاہ
عتابے نہاں اندر و صد خطاب
خطابے نہاں اندر و صد عتاب
بہر فوش او نیش ہا جاں گزار
بہر نیش او نو شہادہ گزار
بیک دست شمشیر بہر آزار
بیک دست دریائے گوہر شہاد

اس مثال میں گلستاں اور پریشاں کے مضمون میں کسی قدر فوق ہے گلستاں
میں کسی خاص گروہ کی تخصیص نہیں ہے۔ اور پریشاں میں لشکر کے مفرد و سبب
کی تخصیص ہے اس لیے پورا پورا مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن چونکہ نفس مضمون متضاد ہے
اس واسطے کچھ کچھ پہلو مقابلے کے محل سکے ہیں۔ شیخ کا بیان لفظاً و معنی کا آنی
کے بیان سے براہ فائق تر ہے۔ اول تو شیخ کے فقروں میں ایک خاص قسم کا
وزن اور قول ہے جو قافی کے فقروں میں نہیں ہے منقثر میں ایسا تناسب نہیں ہے

معنی مقصود اور فصاحت و بلاغت میں کچھ فرق نہ آئے۔ پرلے درجے کا کمال
 انشا پر دازی اور اعلیٰ سے اعلیٰ رتبہ کی شاعری ہے شیخ کے چاروں فقروں
 میں الفاظ متقابلہ ایسی خوبی سے واقع ہوئے ہیں کہ معنی مقصود کو ان سے اور زیادہ
 روشن ہو گئی ہے۔ یعنی خشم اور لطف۔ پیش از حد اور بے وقت۔ وحشت اور ہیبت
 آرد اور بیزد۔ درشتی اور نرمی کو جو مفصلاً کی حالت سے تمثیل دی ہے وہ کسی بلخ
 ہے اور کس قدر مختصر لفظوں میں ادا کی گئی ہے۔ اور دوسری بیت میں کتنا وسیع
 مضمون دو مصرعوں میں بیان کیا ہے یعنی یہ کہ درشتی کو اپنا شمار بنالینا اور کبھی
 نرمی نہ برتنا جیسا کہ لفظ پیش گرفتار سے مستفاد ہوتا ہے اچھا نہیں کیونکہ عقلمند
 ایسا نہیں کرتے اور بالکل نرمی ہی نرمی برتنا اور کبھی درشتی نہ کرنا جیسا کہ شستی
 کے لفظ سے مفہوم ہوتا ہے یہ بھی اچھا نہیں ہے کیونکہ اس سے انسان لظروں
 میں حقیر ہو جاتا ہے۔ پھر دوسری نظم میں صرف اتنی سی بات کو کہ نیلی بے محل
 کرنی نہیں چاہیے، کیسے عمدہ پیرائے میں بیان کیا ہے۔ خصوصاً چنداں کا قافیہ
 متناسب اور ہم وزن لانے کے لیے کس مطلب کو کین لفظوں میں ادا کیا ہے۔ حقانی
 کی شریں بمقابلہ شیخ کی نثر کے کوئی خوبی جو قابل ذکر ہو نہیں پائی جاتی۔ اور نظم میں
 بھی حقیقت اور معنی کی نسبت الفاظ کی چمک دمک زیادہ ہے۔ چونکہ دونوں محاسنوں
 میں فرق بیّن معلوم ہوتا ہے اس لیے پریشاں کی عبارت میں زیادہ نکتہ چینی کی
 کی ضرورت نہیں سمجھی گئی +

آب ہم ان اضافی خوبیوں کا بیان چھوڑ کر گلستان کے ذاتی محاسن کی طرف پھر
 متوجہ ہوتے ہیں۔ اس کتاب کی عمدہ خاصیتوں میں سے ایک یہ خاصیت بھی غامضی

لٹریچر میں نہایت عجیب اور قابل لحاظ ہے کہ فارسی اور اردو کی تحریر و تقریر میں جس قدر
فلکستان کے جملے اور اشعار اور مصرعے ضرب المثل ہیں اور کسی کتاب کے نہیں
دیکھے گئے ان میں سے کسی قدر یہاں نقل کیے جاتے ہیں :-

- ۱- ہر عیب کہ سلطان پسند و بہتر است - ۱۳- در باغ لاله زوید و در شوزہ بوم خس +
- ۲- ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت + ۱۴- تو آنگری بدل است و بہاں و بزرگی
۳- حاجت مشاطہ نیست ز دے دھارام - ۱۵- دشمن چہ کند چو مہربان باشد دوست +
- ۴- ہر چہ بقامت کہتر بر قیمت بہتر + ۱۶- جسور اچہ کم کوز خود بر بخ درست +
- ۵- ہر کہ دست از جان بشیر چہ در دل اندوگود - ۱۷- قدر عافیت کسے دانند کہ بھیتے گرفتار آید +
- ۶- وہ درویش دیکھے بچپند و دو بادشاہ در
اقلیمے نہ گنجد + ۱۸- آناں کہ غنی تر اند محنتیج تر اند +
- ۷- ہر چشمہ شاید گرم شبن بپیل - ۱۹- چو عضوے پدر آوزد روزگار
چو پرشد نشاید گذشتن بپیل + ۲۰- دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم +
- ۸- ہر تو نیکیاں نہ گیر و ہر کہ میناوش بدست + ۲۱- گاہے بسلائے بر بخند و گاہے بد شنائے
۹- افنی را گشتن و بچہ اش را گاہد شستن
کار خرد منداں نیست + ۲۲- ہر کجا چشمہ بود شیریں
خاندان نبوتش گم شد + ۲۳- راتنی ہو جب رضا ہے خدا کے
۱۰- سپر نوح با بدان شبست
۱۱- دشمن نتوان حقیر و بچارہ شود + ۲۴- کس غنیمت کہ گم شد از روز است +
- ۱۲- عاقبت گرگ زادہ گرگ شود +

۳۳- آں را کہ حساب پاک است انجاسہ
چہ پاک +
۳۴- تو پاک باش برادر مدار از کس پاک
نہند جامہ تاپاک گاؤں برسنگ
۳۵- ماتریاق از عراق آوردہ شود ہمار
گزیدہ مژدہ شود +
۳۶- بریا در منافع بے شمار است
اگر خواہی سلامت بر کنار است +
۳۷- دوست آں باشد کہ گیرد دست دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی +
۳۸- در مسیرو وزیر و سلطان را
بے وسیلت بگردیز من
۳۹- سگ در باب چو یافتہ غریب
ایں گریں گرفت و آں من +
۴۰- خداے رست محکم بزرگی و طاعت
کہ جرم بیند و ناں بر قرانی دارد +
۴۱- بنیاد ظلم اول و چہاں ملک پوہر کہ آمد
براں مزید کرد تا بدیں غایت رسید +
۴۲- ہر کہ با فلولاد باز و پنجہ کرد

ساعید سیمین خود را رنجہ کرد +
۳۳- چو کردی با کلونخ انداز پیکار
سیر خود را بست ادانی شکستی
چو سنگ انداختی ہر دے دشمن
خند کن کاندرا آجیش شکستی +
۳۴- کس نیاموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد +
۳۵- دریاب کنوں کہ نعمت ہست بدست
کایں دولت و ملک میرود دست بدست +
۳۶- گروزی را حنہ ابر سیدے
ہیمناس کز نلک ملک پودے +
۳۷- برگردن او بماند و ہر ماہ یکدہشت +
۳۸- اگر نہ روز را گوید شب است ایں
بیاید گفت اینک ماہ و پرویں +
۳۹- جہاں دیدہ بسیدار گوید و رفیع +
۴۰- چو کارے بے فتول من بر آید
مرا دروے سخن گفتن نشاید +
۴۱- اگر روزی بدانش بر فرو دے
دنداواں تنگ تر و زنی نمودے +

یہ کہ بایگانگان در بوستان؟

۵۵- زن بد در سراپے مرد نکو

ہم دریں عالم است دوزخ ادب

۵۶- کوفتہ را نان تھی کوفتہ است +

۵۷- او خوشی تن گم است کار ہستی کند +

۵۸- باطل است آنچه تدعی گوید +

۵۹- مرد باید کہ گیر و اندر گوش

در نوشتہ است پند پر دیوار +

۶۰- خاک شو پیش ازاں کہ خاک شوی +

۶۱- اگر خاکی نباشد آدمی نیست +

۶۲- ہمو اگر شتاب کند ہمو تو نیست +

۶۳- جوے بد در طبعیے کہ نفست

نزد و جز بوقت مرگ از دست +

۶۴- حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است

رفتن بہ پایے مردی ہمایہ دشت +

۶۵- خوردن برائے زلیقہ ذکر کردن است

کو معتقد کہ زلیقہ از بہر خوردن است +

۶۶- نہ چنداں بخور کہ ز دہانت برآید

نہ چنداں کہ از صنف جانستد +

۶۲- محتسب را درون خانہ چہ کار +

۶۳- ہر کو عیب دگر ایں پیش تو آورد و شمر

بے گنا عیب تو پیش دگر ایں اہر +

۶۴- یار شاطر نہ یار حیا طر +

۶۵- چو از قوے یکے بے دانشی کرد

نہ کہ را منت نہت ماند نہ بہر +

۶۶- من آنم کہ من دانم +

۶۷- گئے بر طارم اعلیٰ نشینم

گئے بر نشت پایے خود نہ نیم +

۶۸- فہم سخن گرد نہ کند مستمع

قوت طبع از متکلم مجرے +

۶۹- خانہ دوستان بروبہ در دشمنان کوٹ

۷۰- درویش صفت باش کلاہ تری دار +

۷۱- نیک باشتی و بدست گوید سلق

یہ کہ بد باشتی و نیکت گوید +

۷۲- اگر دنیا نباشد در دمنیم

و گر باشد بہر ش پایے بنیم +

۷۳- درویش ہر کہ شام سرے است +

۷۴- پایے در پنجہ پیش دوستان

۶۷۔ عطا ہے اور ہلقا ہے اور بخشیدم :

۶۸۔ ہر کرناں از عمل خویش خور :

۶۹۔ گاہ باشد کہ کود کے ناداں
بنحط برہن ز ندرتیرے :

۷۰۔ گردن بے طع بلند بود
۷۱۔ ایں شکم بے ہنر بیج بیج
صبر ندارد کہ باز دہ بیج :

۷۲۔ کیے نقصان مایدہم شامتہ ہمایہ

۷۳۔ اگر از ہر دو جانب جاہلانند
اگر زنجیر باشد بگسلانند :

۷۴۔ مرا بخیر تو امید نیست بدرماں :

۷۵۔ تو بر اوج فلک چو دانی صیت
چوں ندانی کہ در سرای تو کیست :

۷۶۔ اگر تو قرآن پیریں منط خوانی

ببسی روی رونق مسلمانی :

۷۷۔ چشم بد اندیش کہ بر کندہ باد

عیب نماید ہنر شش و نظر :

۷۸۔ فلکونی بابدال کردن چنان است

کہ بد کردن بجائے نیک مراء :

۷۹۔ سر ز اندازی سر خویش گیر :

۶۸۔ منت حاتم طائی نہ بود :

۶۹۔ گریہ سکیں اگر پرداشتے

خشم کج شک از جہان برداشتے :

۷۰۔ مور ہاں بہ کہ نباشد پریش :

۷۱۔ گفت چشم تنگ دنیا دار را

یا قناعت پیر کند یا خاک گور :

۷۲۔ منعم بگوہ و دوست دیباہاں غریبیت :

۷۳۔ شاہراں جاکہ زود عزت و حرمت

در بر مانند بقرش پر دام خویش :

۷۴۔ یہ از روی زیباست کو از خوش

کاین حظ نفس است و آن قوت روح :

۷۵۔ رزق ہر چند بے گماں برسد

شرط عقل است محبتن از در ہاد :

۷۶۔ بدو ز طمع دیدہ ہونند :

۷۷۔ مور چکاں راجہ بود اتفاق

شیر شیریاں را بر اند کویت :

۷۸۔ صیاد نہ ہر بار شکار کے پیرد

- ۹۰- ناز براں کن کہ خریدہ رست +
 ۹۱- خطا کے بزرگاں گرفتار خطاست +
 ۹۲- چوں غنط شد اعتدال مزاج
 نہ عزیمیت اثر کند نہ علاج +
 ۹۳- جوان اگر تیرے در پیلو نشیند کہ بیچ +
 ۹۴- تو بجایے پیرچہ کردی خیر
 تا ہماں چشم داری از پست +
 ۹۵- ہسپ تازی دو گدرد و دشتاب
 اشتراہستہ می رود دشت روز +
 ۹۶- حنبر عیے اگر بکے زود
 چوں بیاید ہنوز خربا شد +
 ۹۷- میراث پرخواہی علم پر آموز +
 ۹۸- اگر صد عیب دارد مرد دروین
 رفیقانش یکے از صد نہ اند
 و گریک ناپسند آید ز سلطان
 ز اعلیٰ با تعلیم رسانند +
 ۹۹- ہر کہ در خردیش ادب نکنی
 در بزرگی صلاح از دست +
 ۱۰۰- ہراں طفل کو جو کہ مزگار
- نہ بیند جفا بیند از روزگار +
 ۱۰۱- جو رہا است مادہ ز مہر بدر +
 ۱۰۲- چو دولت نیست خراج آہستہ حرکت کن +
 ۱۰۳- کرکای را بدست اندر درمست
 خداوندان نعمت را کہ تم نیست +
 ۱۰۴- پراگندہ روزی پراگندہ دل
 خداوند روزی بخت مشتعل +
 ۱۰۵- سکے را گر کاہتے بر سر آید
 ز شادی بر جہد کایں استخوان است
 و گر نقشے دو کس بردوش گیرند
 لیم الطبع پندارد کہ خوان است +
 ۱۰۶- ہر جا کہ گل است خار است +
 ۱۰۷- دست نہ کہ خدمت سلطان ممکن
 منت شناس از کہ بجدت شدت +
 ۱۰۸- نہ محقق بود نہ دانمنشند
 چار پائے برو کتابے چند +
 ۱۰۹- پیش دیوار پنچہ گوئی ہوش دار
 تا نباشد در پس دیوار گوش +
 ۱۱۰- ہر کس را عقل خود کہاں نماید
 دوزخ و جہنم خود بجا

- ۱۱۱۔ گراں بیض پر میں عقل منعقد کر دو
عظمت ر بگوید +
- ۱۱۵۔ انک اندک ہم شود بسیار +
نخود گماں نہ بر ویج کس کند نام +
- ۱۱۶۔ کہ بسیار خوارست بسیار خوار +
۱۱۲۔ کہ خجست نفس نہ گردد بسیار معلوم +
- ۱۱۷۔ درشتی و نرمی ہم در ہے است
۱۱۳۔ جو رگ زن کہ جراح و مرهم نہ است +
- ۱۱۸۔ کہن جامہ خویش پر استن
۱۱۴۔ مشک آفتست کہ خود بویزد کہ
رہ از جامہ عاریت خواستن +

یہ تمام مقولے جو نقل کیے گئے ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جو تحریر اور تقریر دونوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر تقریباً اسی قدر اور فقرے اور اشعار گلستاں میں بھی ایسے ہیں جو محض تحریروں میں برتے جاتے ہیں وہ یہاں نقل نہیں کیے گئے۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ دنیا میں جہاں جہاں گلستاں اور بوستاں شائع ہوئی ہیں وہاں زیادہ تر ان کا استعمال کم عمر اور بے استعداد لڑکوں کی تعلیم و تعلم میں پایا جاتا ہے۔ اور اسی لیے چھ سو برس سے شیخ کے یہ دونوں کارنامے برابر بانیچہ طفلان اور دست خوش کوکال رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس سن و سال کے لڑکوں کو یہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کی استعداد اور سمجھ اس قابل نہیں ہوتی کہ شیخ کی فصاحت و بلاغت کا جو کہ اس نے ان کتابوں میں برتی ہے کچھ بھی اندازہ کر سکیں۔ لیکن چونکہ کوش کا حافظہ عمدہ ہوتا ہے۔ اس لیے کچھ کچھ فقرے یا اشعار ان کو یاد رکھ جاتے ہیں پس جس قدر گلستاں اور بوستاں کے فقرے اور اشعار بول چال میں شرب اہل ہو گئے ہیں ان میں سے زیادہ تر وہ ہیں جو لوگوں کو بچپن سے نوک زبان ہوتے ہیں اور جن کے معنوں سے وہ باوجود صغر سن کے لذت یاب ہونے لگے ہیں ورنہ اگر یہ کتابیں بھی شکسپیر پلزی کی طبع ایشیا کے ہر طبقے اور ہر گروہ کے مطالعے

میں رہتیں۔ اور عورت مرد اور بوڑھے اور جوان سب کے گان کو دیکھا کرتے تو میں اُمید کرتا ہوں کہ گلستاں کا ایک بڑا حصہ اور اُس سے کسی قدر کم بوستاں کے اشتہار جمہور کی زبان پر اسی طرح جاری ہوتے۔ جیسے مذکورہ بالا فقرے اور اشعار زبانِ دماغ عام ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کتابوں میں شیخ کا بیان اس قدر عام طبائع کے مناسب ہر فقرہ اور گروہ کی ضرورت اور مذاق اور اغراض کے موافق واقع ہوا ہے کہ ہر فقرے اور ہر شعر میں ضرب المثل ہونے کی قابلیت پائی جاتی ہے۔ ہمیشہ وہ اقوال و اشعار بننے میں جن کا مضمون عام لوگوں کے حسب حال ہو۔ الفاظ سیدھے اور صاف ہوں اور انداز بیان میں کسی قدر لطافت پائی جائے۔ سو یہ خاصیت شیخ کے کلام میں عموماً اور گلستاں بوستاں میں خصوصاً پائی جاتی ہے *

یہاں ہم گلستاں کے متعلق بحث ملتوی کر کے کسی قدر بوستاں کا حال لکھتے ہیں۔ یہ کتاب بھی تقریباً اُسی قدر مقبول ہوئی ہے جس قدر گلستاں اور اس کی تعلیم بھی اکثر ملکوں میں اسی طرح جاری ہے جیسے گلستاں کی مثنوی فردوسی کو عموماً تمام شعرا پر ترجیح دی گئی ہے۔ اور حقیقت میں رزم کا بیان باوجود نہایت سادگی اور صفائی کے جیسا مثنوی اور پرچوش اُس کے قلم سے تراویش کرتا ہے ایسا اور کسی سے بن نہیں سکتا مثنوی میں مطلقاً فردوسی کو سب سے افضل قرار دینا ٹھیک نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک جس طرح طعن و ضرب اور جنگِ حرب کا بیان فردوسی پر ختم ہے اسی طرح اخلاق و نصیحت پر بندِ عشق و جوں کی ظرافت و مزاح۔ تہذیب و تریا وغیرہ کا بیان شیخ پر ختم ہے۔ شاہناہ میں جہاں کہیں فردوسی کو بہادری اور رزم کے سوا کوئی اور بیان کرنا پڑتا ہے وہاں اُس کے کلام میں وہ خوبی اور لطافت نہیں پائی جاتی۔ یہی سبب ہے کہ اُس کی عشقیہ مثنوی

یوسف و یٰٰلٰہٰ اس قدر مقبول نہیں ہوئی جس قدر شاہنامہ مقبول ہوا ہے۔ شیخ نے بوسٹا میں لکھا ہے کہ ایک شخص نے میرے کلام کی بہت سی تعریف کرنے کے بعد مجھ پر اعتراض کیا کہ اُس کو بہادری اور رزم کا بیان کرنا دوسیا نہیں آتا جیسا کہ اور لوگوں کو آتا ہے۔ یہ قصہ نقل کر کے شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ ہم کو ایرانی کا خیال ہی نہیں ہے ورنہ ہم کسی بیان سے عاجز نہیں ہیں۔ ممکن ہے کہ میں اپنی بیچ زبان کو میان سے نکال کر تمام دفتر شعر و سخن پر قلم پھیر دوں۔ اس کے بعد ایک حکایت شاعر صفا بانی کی جگہ تاتار کے ذکر میں لکھی ہے جس سے اپنا ذریعہ بیان دکھانا مقصود ہے۔ اگرچہ شیخ کی شیریں زبانی اور فصاحت کا انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن شاہنامہ کی نظم کے سامنے اس کا رنگ جتنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ قلم محسوسات اور وجدانیات کے مرغوب و نامرغوب ہونے میں اُلف و عادت کو بڑا دخل ہے۔ مچ جس قدر عام ہندوستانیوں کو عادت مستمر کی وجہ مرغوب ہے اُسی قدر اکثر غیر ملک والوں کو فلاح عادت ہونے کے سبب سے نامرغوب ہے، اکثر عظیم کو خوشگوار اور غیر ملک والوں کو سخت ناگوار معلوم ہوتے ہیں۔ اسی طرح لطف شعر جو کہ ایک وجدانی امر ہے بغیر اُلف و عادت کے ہرگز محسوس نہیں ہوتا۔ مثلاً انیس و دیر کے مرثیے جس پیرائے اور لباس میں مقبول ہوئے ہیں وہ پیرایہ اس قدر بانوس ہو گیا ہے کہ اُس کے بغیر مرثیہ مقبول ہونا مشکل ہے۔ یعنی ضرور ہے کہ کچھ بند تلواری کی اور کچھ گھوڑے کی تعریف میں۔ لکھے جائیں۔ کچھ بند ایسے بھی ہوں جن سے خود مرثیہ گو کی فوقیت اور دس پٹا ہرگز یہی ضرور ہے کہ مرثیہ مُستدس میں لکھا جائے اور مُستدس انھیں مردوں میں سے کسی عریں جو جوانیس و دیر نے اختیار کی ہیں۔ پس جن خصوصیتوں کے ساتھ شاہنامہ مقبول ہوا ہے

اُن کے بغیر کسی کی رزمیہ نظم مقبول نہیں ہو سکتی۔ ضرور ہے کہ خالص فارسی میں جمہوری الفاظ سے پاک ہو زدم لکھی جائے۔ اور بے شمار الفاظ جن میں فردوسی نے تصرف کیا ہے۔ اور قیاس لغوی کے خلاف استعمال کیے ہیں۔ کبھی کبھی قصداً اُسی طرح برتے جائیں جیسے شاہنامہ میں برتے گئے ہیں اور بے انتہا حشو و زوائد جن سے شاہنامہ بھرا ہوا ہے اشعار میں یہ کلفت داخل کیسے جائیں۔ پس شیخ کی رزمیہ حکایت جو شاہنامے سے میل نہیں کھاتی۔ اس کا یہی سبب ہے کہ شیخ نے ان باتوں سے کسی بات کا التزام نہیں کیا۔ فردوسی نے بھی یہی گرا اختیار کیا تھا جس سے اُس کی ثمنوی مقبول ہوئی۔ و دقیق نے جو فردوسی سے پہلے ہزار بیتوں میں گشتا سپ اور آرجاسپ کی داستان نظم کی تھی وہ سب کو پسند آچکی تھی۔ جب دقیق وہ داستان لکھ کر دفعہ مرگیا اور فردوسی کی نوبت آئی تو اُس نے بھی وہی روش اختیار کی جو دقیق نے اختیار کی تھی۔ چنانچہ دقیق کی لکھی ہوئی داستان عام شاہناموں میں موجود ہے۔ دونوں کے کلام میں کوئی نمایاں فرق نہیں معلوم ہوتا۔ یہاں تک کہ لوگ اس حال سے واقف نہیں ہیں کہ اُس کی بھی فردوسی ہی کا کلام سمجھتے ہیں۔ *

فارسی میں چار شنویاں ہیں جو شہرت اور قبولیت میں تقریباً مساوی الاقدام ہیں۔ شاہنامہ۔ مسکنہ زنامہ۔ ثمنوی ثمنوی اور بوستاں۔ شاہنامہ اور ثمنوی ثمنوی کو مسکنہ اور بوستاں سے وہ نسبت ہے جو ایک کامل خوشنویس کی بے ساختہ مشق کو اس کے بنائے ہوئے اور مرتب کیے ہوئے قطعہ سے ہوتی ہے۔ قطعہ اگرچہ رخ اور کرسی اور حروف کی نشست اور تقسیم وغیرہ کے لحاظ سے مشق کی نسبت بے عیب ہوتا ہے اور اُس کے اجزائیں بہت و بلند کا تفاوت بہت کم ہوتا ہے اور تمام حروف تقریباً ہموار

اور کیا معلوم ہوتے ہیں۔ مگر مشق میں بہت سی کششیں اور دواؤں وغیرہ بے ساختہ اُس کے قلم سے ایسے نکل جاتے ہیں کہ اگر خوشنویس خود کو شش کرے تو قطعہ میں شاید ویسی کششیں اور دواؤں نہ لکھ سکے۔ یہی سبب ہے کہ خوشنویس لوگ اگلے استادوں کی مشق کو اُن کے قطعات سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔ فردوسی اور مولانا روم نے اگرچہ اپنی مثنویوں میں بخلاف نظامی اور سعدی کے الفاظ کی زیادہ تہج و تہذیب و کثرت چھانٹ نہیں کی مگر باوجود اس کے صد ہا مقامات اُن سے ایسے حسن و خوبی کے ساتھ ادا ہوئے ہیں کہ تکلف اور ساختگی کی حالت میں شاید ادا نہ ہو سکتے +

بوتال اور سکندر نامہ صرف اس لحاظ سے کہ دونوں کمال تہج و تہذیب و زہدیت فکر و نظر کے ساتھ لکھی گئی ہیں اور دونوں میں صنعتِ شاعرانہ کا پورا پورا احتیاج ادا کیا گیا ہے شاید ایک دوسرے سے مشابہ ہوں۔ لیکن دونوں کے اندازِ بیان میں بہت بڑا تفاوت ہے۔ سکندر نامے میں شاعرانہ مبالغہ، زورِ بیان، شوکتِ الفاظ، طر فگئی، استعارات، متنوع تمثیلات ایک ایک مطلب نئے نئے اسلوب سے ادا کرنا، ہر داستان کو ایک بڑی دھوم دھام کی عتید کے ساتھ شروع کرنا اور اسی طرح کی اور شان دار باتیں پائی جاتی ہیں۔ برخلاف اس کے بوتال میں نہایت سادگی، الفاظ کی نرمی اور گھلاوٹ، ترکیبوں کا سلجھاؤ، بیان کی صفائی، عبارت کی دلنشینی، خیالات کی ہمواری، مبالغے میں اعتدال، مآخذ میں سہولیت، حسنِ ترتیب، لطیف ادا، تمثیلات کی برجستگی، استعارات کی لطافت، کنایات کی شوخی، باوجود صنعتِ شاعری کے نہایت بے تکلفی اور باوجود ساختگی کے کمال بے ساختہ پن پایا جاتا ہے +

مثلاً اس مطلب کو کہ زمین میں خدا کی بے انتہا مخلوق دبی ہوئی ہے مولانا نظامی

سکندر نامے میں اس طرح ادا کرتے ہیں :-

فلک در بلندی زیں درمخاک یکے طشت خوں شد یکے طشت خاک
نبشته بریں ہر دو آلودہ طشت ز خون سیادش بسے سر نوشت
زیں گر بضاعہت بروں آورد ہمہ خاک در زیر خوں آورد

یہی مطلب سکندر نامے میں دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے :-

کہ داند کہ ایں و خمر دامن و دوز چہ تا ریختہ دارد از نیکے بد
چہ نیز نگ با بجزواں ساختہ است چہ گردنکشان را سر انداختہ است
شیخ نے اسی مطلب کو بوستان میں یوں بیان کیا ہے :-

ز دم تیشہ یک روز بر تل خاک بگوشش آدم نالہ و دردناک
کہ ز نساں گرمردی آہستہ تر کہ چشم و بنا گوش در دے ہست و سمر
یہی مطلب بوستان میں دوسری جگہ اس طرح بیان ہوا ہے :-

دریں باغ سروے نیامد بلند کہ باد اجل بخشش انہن نکند
عجب نیست بر خاک اگر گل خلقت کہ چندیں گل ایزم در خاک خلقت

قناعت کی ترغیب سکندر نامے میں اس طرح دی ہے :-

تو نیز از منی بار گردن زد و دوش ز گردن کشاں بر نیاری خروش
چو دریا بہ سرمایہ خویش باش ہم از بود خود سود خود بر تراش
یہ مہمانیے خویش تار و زرگ درختے شواز خوشن ساز و برگ
چو پہلہ ز برگ کساں خورد گاز ہمہ تن شد از بخت و قے کرد باز

بوستان میں یہی مطلب اس طرح ادا ہوا ہے :-

شنیدی کہ در روزگار قدیم
 بہ پنداری ایں قول مقول نیست
 شدے سنگ دست ابدال سیم
 چو قلع شدی سیم و سنگت کیست
 چہ مَشت ز ریش و چہ مَشت خاک
 خبر وہ بدر ویش سلطان پرست
 کہ سلطان زور وین مسکین است
 فریدوں بملک عجم نیم سیر
 گداز کند یک درم سیم سیر
 بہ از باد شاہے کہ خر سندانست
 گدازے کہ بر خاطرش بند نیست
 بہ ذوق کہ سلطان دیوان مخفیت
 بخشند خوش روستانی و جنت
 مال اندیشی اور پیش بینی کی نصیحت سکندر نامے میں اس طرح کی گئی ہے:-

میہلکن گول گر چہ بار آیدت
 خرقے بر کر یوہ ز سختی بزو
 کہ ہنگام سہرما بکار آیدت
 کہ از کاہلی جُسل با خود نبرو
 یہی مضمون بوستاں میں اس طرح ادا کیا گیا ہے:-

بز ختر چہ خوش گفت بانو بہ وہ
 ہمہ وقت پردار مشک و سُبُوکے
 کہ روز نوابرگ سختی بہ نہ
 کہ پیوستہ و بدہ رواں نیست بخجے
 سکندر نامے میں عہد شباب پر تحشر اس طرح کیا گیا ہے:-

جوانی شد و زندگانی نہ اند
 جوانی بُود خوبے آدمی
 جہاں گو نماں چوں جوانی نہ اند
 چو خوبی رُود کے بود خرمی
 چو پے سست و بوسیدہ شد اتخول
 و گر قصتہ خوب روی مخواں
 غرور جوانی چو از سہر گدشت
 ز گستاخ کاری فرو شوی دست
 بہی چہرہ باغ چنداں بُود
 کہ شمشاد بالالہ چنداں بُود

چو بادِ حسنرانی در آفتدِ بیاغ
 بود برگِ ریزاں چو شلخِ بلند
 زمانہ وہد جا کے ٹلیل بیزاغ
 دلِ باغبانِ نازاں شود در دمنہ
 ریاحینِ زبستان شود ناپدید
 بنالِ اے کن ٹلیس سالخورد
 دو تاشد سہی سسر و آناستہ
 چو تابیخِ پنجبہ در آمد بہ سال
 سراز بار سنگی در آمد پینگ
 فرو ماند دسم ز نے خواستن
 تنم گونہ لا جور دی گرفت
 ہیونِ موندہ ز رہ ماندہ باز
 ہماں نور چو گانے با و پای
 طرب را بہ میخانہ گم شد کلید
 بوستاں میں یہی مضمون ایک حکایت کے ضمن میں اس طرح ادا کیا گیا ہے :-
 چو بادِ صبا بر گلستاں نژد
 چند تا جوان است دسر سبز خجید
 ہمراہاں کہ باد آورد بید مشک
 نہ زیبہ مرا با جواناں چمید
 بقید اندرم حیرہ بازے کہ بود
 شمار است نوبت بریں خواں نشست
 چمیدن درختِ جواں راستہ زو
 خشک شد چوں بزدی رسید
 بریزد درختِ کمن برگِ خشک
 کہ بر عارضِ صبح پیری دمید
 دما دم سر رشته خواہد رُبود
 کہ ما از تنم بشتیہ دست

چو بر سر نشست از بزرگی غبار
 مرا بر فتن بارید بر پتہ زارغ
 کند جلوه طائوس صاحب جمال
 مرا غلہ تنگ آمد اندر درو
 گلستان مارا طراوت گذشت
 مرا تکیہ جان پر بر عصا ست
 مسلم جوان رست بر پایہ حبست
 گل سیرخ رویم نگر ز تر ناب
 ہوس بختن از کودک ناقصام
 مرا می بیاید چو طفلان گر لیت
 نگو گفت لفتماں کہ ناز و سیت
 ہم از باداواں در گلبہ بست
 جوان مارساند سیاہی بہ نور
 تیر و سپر مسکیں سپیدی بگور
 دگر چشم عیش جوانی مدار
 نشاید چو بلبل تماشا ہے مانع
 چہ می خواہی از باز پر کندہ بال
 شمارا کنوں مے و دم سبزہ نو
 کہ گلہ ستہ بند و چو پیر مردہ گشت
 دگر تکیہ بر زندگانی خلاست
 کہ پیراں بر زند استعانت بدست
 فرورفت چوں زرد شد آفتاب
 چناں زشت نبود کہ از پیر خام
 ز شرم گناہاں - نطفانہ ریت
 یہ از سالہا بر خطا ریت
 یہ از سود سراپہ داوای زیت
 تیر و سپر مسکیں سپیدی بگور

مذکورہ بالا مثالوں کے ملاحظہ سے صاف ظاہر ہے کہ شیخ کے خیالات ہمیشہ سہل الفاظ
 ہوتے ہیں۔ وہ معنی مقصود کو ایسی تمثیلوں میں بیان کرتا ہے جو ہمیشہ خاص و عام کے
 مشابہے میں آتی ہیں۔ بجائے مولانا نظامی کے کہ اُن کے خیالات اور تمثیلات اکثر
 غریب، اور قدرت سے خالی نہیں ہوتیں +

شیخ نے جو شاعر صفا ہانی کی حکایت میں اپنا زہر تیر بیان دکھا یا ہے اگرچہ بے تکلفی
 اور سادگی میں فردوسی کے بیان سے نہیں ملتا۔ لیکن مولانا نظامی کی زہر سے جس میں سادگی

کی نسبت شاعری کا زیادہ لطیف ہے بہت مشابہت رکھتا ہے۔ چند شعرا اس حکایت کے ادماں کے ہم مضمون اشعار سکندر نامے کے اس مقام پر نقل کیے جاتے ہیں:-

بوستان

سکندر نامہ

دوشکر بہم بزدند از گیس
نیر و جہاں و جہاں ہاں ہاں
پشمشیر نو لاد تیر خدنگ
گذر گاہ بر مور کرد ز تنگ
کند از دہاے مسلسل شکنج
دہن باز کردہ بت اراج گنج
زمین کو بیسٹے بڈا راستہ
عبارے شد از جہاے بڑا ستہ
بر انجخت رزمے چو بارندہ منج
مگر گش ز پکان دباراں ز تیج

دوشکر بہم بزدند از گیس
نو گشتی ز دند آسماں بر نیس
ز باریدن تیر ہجوں مگر گ
بہر گوشہ بر خاست طوفان مرگ
بصید ہر بیان پر خاش ساز
کند از دہاے دہن کرد ہباز
زمین آسماں شد ز گرد و کبود
چو آنجسم در و برق شمشیر و خود
چو آبر اسب تازی بر آئے ختم
چو باراں پارک فرو ریختم

مگر حق یہ ہے کہ ایک دوحکایت کے بلا دینے سے مساوات اور برابری کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔
زہم میں فروہی اپنی جگہ اور نظامی اپنی جگہ فی الحقیقت اپنا مثل نہیں رکھتے +
شیخ علی حزیں نے جس کو ہندوستان میں خاتم الشعرا سمجھتے ہیں میں بائیں صفحہ
کی ایک فتویٰ جس کا نام خوابات ہے بوستان کی طرز میں لکھی ہے اور اپنی عادت کے
موافق اس پر بہت کچھ افتخار کیا ہے۔ چنانچہ فتویٰ کے خاتمے میں فرماتے ہیں :-
سین سچ گر بہت ہشیار مغرور گند قوت جاں ایں گہرے تفر

انہیں نامہ گردوں پر آوازہ شد روان سخن گستران تازہ شد
نوائے کہ ایں خامہ بنیاد کرد دلِ تھو سی و زود کی شاد کرد
بگوشش نظامی اگر سے رسید سرو سے انہیں حشر وانی نشید
بہ عظیم من مٹج نہاد سے بجاگ کہ احسنت اسے نیر تابناک
وگر سے شہد پرور ادا شنیدے ز صو ر مئے من نوا
سما عش ز سر عقل برودے دہوش زباں مہر کر دے شد سے جلد گوش

معلوم ہوتا ہے کہ علی حریف نے اپنے نزدیک اس شہنوی میں بوستاں کے قتیق کا پورا پورا حق ادا کیا ہے اور وہ اس کو اپنے لیے ایک سرہانہ ناز بھگتا تھا۔ سولہ عمری میں ہی شہنوی کی نسبت لکھتا ہے کہ ”بسیارے از مطالب عالیہ و سخنان دلپذیر در ان کتاب بسبک نظم و آواز“ مگر دونوں کتابوں یعنی بوستاں اور خرابات کے مقابلہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دو صورتیں ایک شکل کی ہیں، ایک جائزہ دوسری بے جاں۔ لفظ اچھے بیان اچھا۔ مطالب عمدہ۔ یہ سب کچھ سہمی۔ مگر شیخ کے بیان میں ایک چھپا ہوا جادو ہے جو بوستاں کو خرابات سے بالکل الگ کر دیتا ہے۔ چنانچہ ذیل کی مثال سے دونوں کا فرق بخوبی معلوم ہو سکتا ہے قحط کا بیان ایک جگہ بوستاں میں بھی کیا گیا ہے اور خرابات میں بھی اتفاق سے یہ مضمون نکل آیا ہے۔ ہم دونوں کے اشعار اس مقام پر نقل کرتے ہیں اور فرق جو دونوں کے طرز بیان اور طریقہ ادائیں ہے اس کو بھی کسی قدر بیان کرینگے :-

خرابات

شنیدم کہ در عہد بہرام گور
نمود از قضا قحط ساسے ظہور

بوستاں

چناں قحط ساسے شد اندر دشت
کہ یاران فراموش کردند عشق

۲ چاں آسماں برزیں شد بخیل
کے لب تر نکر دند زرع و غنیل
۳ بخوشید سر چشمہ بائے قدیم
نماند آب جز آب چشم یتیم
۴ نہ بودے کج بند آوہ ز نے
اگر بر بندے دودے از روز نے
۵ چو درویش بے برگ دیدم خست
قوی باز و اس مست و در ماندہ خست
۶ نہ در کوہ سبزی نہ در باغ شیخ
کلیغ بوستان خور و فردم کلیغ
۲ چو صحرے محشر زیں تن گرفت
بر یوزہ آسماں کف گرفت
۳ سحاب سیمہ دل نشد مہرباں
بحال لب تشنہ مخاکیاں
۴ بجھیلی منو آبر بر کائنات
بہ مہد زیں سوخت طغسل نبات
۵ ز خشکی در اندام خاک و دتوہ
عروق شجر شد چو رگماے کوہ
۶ ز تاب منہ وزندہ مہر بلبلند
زیں مجرودانہ بودش سپند
۷ لہائے چوستان بے شیر شد
ز خشکی چو پکان گلو گیسر شد

شیخ سعدی نے پیدہ ہی شعر کے دوسرے مصرعوں میں حسن و لطافت کے ساتھ تھکی سختی کی تصویر کھینچی ہے اس سے بہتر کوئی اسلوب بیان خیال میں نہیں آتا۔ قحط کی شرح ایک کتاب میں ایسی خوبی کے ساتھ نہیں ہو سکتی جیسی اس ایک مصرعے میں ہوئی ہے کہ باراں فراموش کرد عشق، سہل و مستمع کا لفظ جو اکثر بولا جاتا ہے وہ ابی تمام کے بیان کو کہتے ہیں کہ بادی النظر میں نہایت سرسری معلوم ہو۔ مگر وہی مطلب دوسری بار کسی سے بلکہ خود مصنف سے بھی دیا بیان نہ ہو سکے اس بیان میں لطف یہ ہے کہ قحط کے بیان کے جتنے معمولی اسلوب ہیں یہ اسلوب ان سب سے علیحدہ ہے قحط کی سنی ہیئت اس طرح

بیان کی جاتی ہے۔ ”ایسا قحط پڑا کہ روٹی جان سے زیادہ عزیز ہو گئی۔ آدمی بھوک میں آدمیوں کو کھاکے۔ ماں باپ نے ایک ایک روٹی کے بدلے اولاد کو بیچ دیا۔ لاکھوں جاندار بھوکے مر گئے۔“ غرض کہ تمام بیان ایسے ہوتے ہیں جن سے غصے کی گرائی۔ پانی کی نایابی۔ بھوک کی تکلیف اور اور اسی قسم کی باتیں سمجھی جائیں شیخ نے وہ اسلوب اختیار کیا ہے جو سب سے بڑا اور سب سے بلیغ ہے۔ اس اسلوب سے اُس کو یہ جتنا مقصود ہے کہ شاعر کے نزدیک عشق ایک ایسی چیز ہے جو کسی حالت میں فراموش نہیں ہوتی باوجود اس کے لوگ اُس کو بھول گئے تھے۔ اور یاراں کے لفظ سے یہ ظاہر کہ منظور ہے کہ مصنف بھی اُسی عشاق کے جرگے میں سے تھا۔ دوسرے شعر کا صرف یہ مطلب ہے کہ میں نہ بڑا تھا۔ مگر اُس کو کس عمدگی سے بیان کیا ہے میرے شعر میں پانی کا نایاب ہونا اور پھر یتیم کے آنسو کو اس سے مستثنیٰ کرنا۔ چوتھے شعر میں کسی کے گھر کے روزن سے باو چننا نے کے دھوئیں کا نہ مٹلنا اور پھر اُس سے رائدوں کی آہ کے دھوئیں کو مستثنیٰ کرنا۔ پانچویں شعر میں درختوں کو بے برگگی میں قحط زدہ درختوں اور سکینوں سے تشبیہ دینا اور تومی پہلوانوں کا بے بس اور عاجز ہو جانا یہ تمام اسلوب کس قدر لطیف اور دلکش ہیں۔ چھٹا شعر بلاغت اور حسن بیان میں تقریباً ویسا ہی اعلیٰ درجے کا ہے۔ جیسا پہلا۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے کوئی بات ایسی نہیں جو عجیب یا عادت کے خلاف ہو۔ قحط میں عشق کے ولولوں کا نیست و نابود ہو جانا۔ درختوں کا سر سبز نہ ہونا۔ چشموں اور نڈیوں کا خشک ہو جانا۔ یتیموں کا رونا۔ گھروں میں کھانا نہ پکنا۔ بے وارث رائدوں کے آہ دنانے۔ درختوں کا بے برگ و بار۔ اور غریبوں کا بے سرد سامان ہونا۔ پہلوانوں اور زبردستوں کا اور ماندہ ہو جانا۔ پہاڑ اور جنگل میں سبزے اور ہریا دل کا

نہ رہنا۔ مٹریوں کا بلغ اور کھیتی کو اور آدمیوں کا مٹیوں کو کھانا۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں جو قحط کے زمانے میں اکثر کم و بیش ظہور میں آتی ہیں +

خریں، نے باوجود اس کے کہ خرابات جو چند اوراق سے زیادہ نہیں ہے۔ بوساں سے پانسو برس بعد لکھی ہے اور جیسا کہ اُس کے بیان سے مترشح ہوتا ہے۔ اپنی پوری طاقت شیخ کے متبع میں صرف کی ہے کوئی کرشمہ اُس کی ثنوی میں ایسا نہیں پایا جلتا۔ جس کو دیکھ کر جی بے اختیار پھٹک اُٹھے +

پہلا شعر ہوا اور صاف ہے اُس میں کوئی قابل ذکر نہیں۔ دوسرے شعر میں زمین تفتہ کو صحرا، محشر سے تشبیہ دینا تعریف السنۃ بالمجمول کے قبیل سے ہے یعنی ایک ایسی تمثیل ہے جو اہل دنیا کی نظر میں قحط کی تصویر کھینچنے سے قاصر ہے۔ صحرا بہ محشر اور تمام اعتقادات خود تمثیل کے محتاج ہیں اُن پر قیاس کرنے سے کسی شے کی حقیقت نہیں کھل سکتی۔ تیسرا بوساں کے اس شعر سے ماخوذ ہے جو ذوالنون مصری اور مصر کے قحط کے بیان میں شیخ نے لکھا ہے اور وہ یہ ہے ۵

خبر شد بے مدین پس از دہر بست کہ ابو سیہ دل برایشاں گریست
مگر اتنا فرق ہے کہ شیخ نے ابر کے برسنے کو رُدن سے تعبیر کیا ہے جس سے ترقم اور بُرستا دونوں باتیں ٹپکتی ہیں اور خریں نے برسنے کو مہربان ہونے سے تعبیر کیا ہے جس سے دُلو معنی دیے صاف نہیں نکلتے۔ چوتھا شعر شیخ کے اس شعر سے ماخوذ ہے ۵

چنناں آسماں برزیں شد بخیل کہ لب تر زدند ز بوع و غمیل
شیخ کے بیان میں اتنا لطف زیادہ ہے کہ کھڑی کھیتی کا خشک ہو جانا زیادہ خطرناک ہے بہ نسبت اس کے کہ تخم زمین کے اندر ہی بُل جائے۔ پانچویں شعر کا دوسرا مصرعہ

ت غمہ ہے مگر پہلا مصرعہ تکلف سے خالی نہیں شعر کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ میں کی خشکی کے سبب درختوں کی رگیں پہاڑ کی رگوں کی طرح سوکھ گئی تھیں پس اندام اور وہ توہ کے لفظ کو افادہ معنی میں کچھ دخل نہیں ہے۔ چھٹے شعر میں صرف یہ بیان ہے کہ آفتاب کی گرمی سے زمین انگلیٹھی کی طرح جلتی تھی اور تخم جو اس پر ڈالا جاتا تھا وہ سپند کا حکم رکھتا تھا پس فروز زندہ اور بلند وجود و صفیتیں مہر کی واقع ہوئی ہیں انہوں نے کچھ فائدہ نہیں دیا اور اگر یہ کہا جائے کہ فروز زندہ مہر کہنے سے آفتاب کی گرمی کا زیادہ ثبوت ہوتا ہے تو ہم کہیں گے کہ تہ بلند کہنے سے اس کی گرمی کا خیال کم ہو جاتا ہے۔ اور ایسی دو متضاد صفیتیں لانی بلاغت کے خلاف ہیں ساتویں شعر کا مضمون بالکل خلاف عادت اور خلاف مقتضائے مقام ہے نہ قحط کا یہ خاتمہ ہے کہ شراب کی صراحی کو خشک کر دے اور نہ صراحی کا خشک ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ قحط کی شدت ہو رہی ہے ۞

یہ جو کچھ ہم نے بطور محاکمہ کے لکھا ہے اس سے خان آرزو کی طرح شیخ علی خزیں پر حزن گیری کرنی ہمارا مقصود نہیں ہے۔ اور نہ توستان کو خرابات سے افضل ثابت کرنا نظر ہے۔ کیونکہ نہ ہم شیخ علی خزیں پر حزن گیری کرنے کی لیاقت رکھتے ہیں اور نہ توستان کے افضل ہونے میں کسی کو شبہ ہے بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ کوئی شے فی نفسہ کسی ہی بے عیب ہو جب وہ کسی ایسی شے کے مقابل میں لائی جاتی ہے جو اس سے برتر تب افضل و خائن ہو تو اس میں بیسیوں فروگزاشتیں اور قصور نظر آنے لگتے ہیں۔ اگر خرابات توستان کے جواب میں نہ ہوتی اور حسن اتفاق سے ایک مضمون کی حکایتیں دونوں مثنویوں میں نہ مخل آیتیں تو خزیں کے بیان میں جون و چرا کرنے کا ہم کو خیال بھی نہ آتا

کیونکہ یہ باتیں تقریباً تمام شعرا کے ہاں عامۃً اور دو ہیں +
 آپ ہم گلستاں اور بوستاں کی چند خاصیتیں ایسی بیان کرتے ہیں جو دونوں
 کتابوں میں تقریباً یکساں پائی جاتی ہیں اور جن کو ان کے مقبول ہونے میں بڑا دخل ہے
 مثالوں کی جہاں ضرورت ہوگی کہیں صرف گلستاں سے اور کہیں صرف بوستاں
 سے اور کہیں دونوں سے نقل کی جائیگی +

اکثر لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ان کتابوں کے مقبول ہونے کا اصل سبب یہ ہے کہ
 ان میں سرتاپا اخلاق اور تہذیبِ نفس کے مضامین مندرج ہیں مگر میرے نزدیک ان کی
 مقبولیت کی اصل وجہ یہ ہے کہ اخلاق اور مواظظ کو شیخ کے سوا کسی نے ایسی خوبی اور
 لطافت کے ساتھ فارسی زبان میں بیان نہیں کیا۔ اخلاق میں میموں کتابیں فارسی میں
 لکھی گئی ہیں اور اب تک موجود ہیں اور غالباً گلستاں اور بوستاں میں کوئی پند و نصیحت
 ایسی نہ ہوگی جو اوروں نے نہ لکھی ہو۔ مگر کوئی کتاب ان دونوں کے برابر مقبول نہیں ہوئی۔
 اس سے ظاہر ہے کہ قبولِ عام کا مدار زیادہ تر حسنِ بیان اور لطافتِ ادا پر ہے نہ کہ نفسِ
 مضامین پر۔ البتہ مضامین کو بھی شہرت اور قبولیت میں بہت بڑا دخل ہوتا ہے۔ اسی
 لیے جو محاسن ان کتابوں کے ہم آگے لکھنے چاہتے ہیں وہ کسی قدر مضامین سے اور
 زیادہ تر حسنِ معنی اور اسلوبِ بیان سے متعلق ہونگے +

۱۔ سب سے زیادہ تعجب انگیز بات ان دونوں کتابوں میں یہ ہے کہ جن باتوں میں مشرقی
 طرزِ فکر عموماً بدنام ہے وہ ان کتابوں میں اس قدر کم ہیں کہ چند مقامات استثناء کرنے کے بعد
 کوئی ایسی بات باقی نہیں رہتی جو زمانہ حال کے مورل اور سوشل خیالات کے برخلاف ہو
 اور یہ اصراری پڑنی کتابوں میں جن کے زمانہ تصنیف کو ساڑھے چھ سو برس سے زیادہ

گزر چکے ہیں کچھ کلم عجیب انگیز نہیں ہے ؟

مثلاً مبالغہ اور اغراق جو مشرقی انشا کا خلاصہ ہے ان کتابوں میں اتنا کم ہے جتنا ایران کے اور شعرا کے کلام میں سچ۔ اور جہاں ہے وہاں نہایت لطیف اور بامزہ ہے اور اعتدال کی حد سے متجاوز نہیں۔ مثلاً شیخ بوستاں میں کہتا ہے :-

میانِ دو کس دشمنی بود و جنگ سراز کبر بر یک دگر چوں پلنگ
ز دید ایریم تا بحد سے زماں کہ بر ہر دو تنگ آمدے آسماں

دوسری بیت کا یہ مطلب ہے کہ وہ ایک دوسرے کی صورت سے ایسے پیار تھے کہ جب کبھی راہ میں دو چار ہو جاتے تھے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر رستے سے اُلٹے ہٹ جاتے تھے اور اُس وقت کمالِ نفرت سے اُن کا جی چاہتا تھا کہ آسماں جو سامنے حائل نظر آتا ہے اس کو توڑ کر نکل جائیں۔ یہ مبالغہ جیسا کہ بادی النظر میں بڑا معلوم ہوتا ہے فی حقیقت ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ نفرت ایک نفسانی کیفیت ہے جس کا کوئی اندازہ اور پیمانہ مقرر نہیں ہے پس جس طرح اُن نے درجے کی نفرت یہ ہے کہ دو دشمن ایک مجلس میں اکٹھا ہونا پسند نہیں کرتے اسی طرح انتہا درجے کی نفرت یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک عالم میں رہنا پسند نہ کریں ؟

اسی طرح شیخ کی نظم و نثر میں جہاں کہیں مبالغہ پایا جاتا ہے لطافت سے خالی نہیں ہوتا۔ مثلاً گستاخاں میں ایک دو تمند بخیل کا ذکر اس طرح کرتے ہیں۔ ”مالِ ارے! شنیدم کہ بخیل چناں معدوف بود کہ حاتم طائی پر سخاوت، ظاہر حالش بہ نعمت دنیا راستہ و خست نفس در نہادش ہمچنان متمکن۔ تا بجائے کہ نانے را بجائے از دست ندامے و گریہ ابوہریرہ را بہ تہمہ نواختے و سگِ احباب کشت را استخوانے غنداختے۔ فی الجملہ کسے خانہ اورا ندیدے در کشادہ۔ و سفرہ اورا سر کشادہ طبت

درود پیش بڑے طعاش نہ شیدے مرغ از بس ناز و رخ ردن اوریزہ بخیدے
ایک آفر جگہ سمندر کی موج اور طوفان کا بیان اس طرح کیا ہے:-
”سہلیں آئے کہ مرغابی درواین نبود“

گر غور سے دیکھیے تو حد سے زیادہ مبالغہ ہے مگر بادی النظر میں کوئی ناممکن بات
نہیں معلوم ہوتی +

سو پر تخیل یعنی فوق العادت باتیں اور عجیب و غریب قصے بھی جن سے قدیم اور
متوسط زمانے کا مغربی اور مشرقی لطیف بھرا ہوا ہے ان کتابوں میں بہت کم ہیں تمام
گلستاں اور بوستاں میں صرف دو تین حکایتیں ایسی ہیں جو اس زمانے میں مستبعد معلوم
ہوتی ہیں اور تاویل کے بعد ان میں بھی کچھ استبعاد باقی نہیں رہتا +

علم اخلاق کے بعض اصول جن میں ہمیشہ اختلاف رہا ہے اور اب بھی چلا جاتا ہے
اگر کسی کتاب میں زمانہ حال کے فلسفہ مسئلہ کے برخلاف ہوں تو اس پر کچھ اعتراض نہیں
ہو سکتا کیونکہ ایسی کوئی کتاب نہیں ہو سکتی جس کی سب باتوں پر تمام عالم کا اتفاق ہو مثلاً
شیخ کے اس فقرے پر کہ دروغ مصلحت آمیز بہ ازراستی فتنہ انگیز اکثر مشنری لوگ کہتے
ہیں کہ جھوٹ کیسا ہی مصلحت آمیز ہو سچ کے برابر اس سے بہتر گروہ نہیں ہو سکتا اس بحث
کے متعلق ہمارے ایک دوست نے نہایت دلچسپ قصہ نقل کیا ہے۔ انھوں نے کہا
کہ ایک علمی سوسائٹی میں چند یورپین عالم اور مشنری موجود تھے۔ راستی اور دروغ پر
ایک مضمون پڑھا گیا۔ جس میں گلستاں کے فقرہ مذکور کی تائید کی گئی تھی۔ ایک پادری تھا
کہ اس مضمون عمدہ ہے۔ مگر جس قدر اس فقرے کی تائید میں لکھا گیا ہے۔ اس میں سے
ال دینا چاہیے۔ اس پر بہت دیر تک بحث ہوتی رہی مگر کچھ فیصلہ نہ ہوا آخر کار ہمارے

دوست جو اس قصے کے راوی ہیں انہوں نے کھڑے ہو کر کہا کہ اس بحث کا حاکم ہوں ہو سکتا ہے کہ اپنے ذاتی اغراض کے لیے تو بیشک جھوٹ بولنا کسی حالت میں جائز نہیں لیکن اگر جھوٹ سے کسی مظلوم کی جان بچتی ہو تو ایسی حالت میں جھوٹ بولنا بیشک بیچ بولنے سے بہتر ہے۔ اس کے بعد انہوں نے یہ مثال دی کہ ششہاء میں جو اکثر لوگوں کے رحم اور انسانی ہمدردی کی راہ سے یورپین عورتوں اور بچوں کو ظالموں اور بے رحموں کے شر سے بچانے کے لیے اپنے گھروں میں چھپا لیا تھا اور باغی لوگ اُن کو ڈھونڈتے پھرتے تھے اور ایک ایک سے اُن کا حال پوچھتے تھے۔ ایسی حالت میں جھوٹ بول کر اُن بیگناہوں کو خطرے سے بچانا بیشک بیچ بولنے سے بہتر تھا۔ اس تقریر کو تمام مجلس نے پسند کیا اور وہ فقرہ سب کے اتفاق سے مضمون میں بحال رکھا گیا۔ مذکورہ بالا توجیہ کی تائید خود شیخ کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔ کیونکہ اُس نے گلستاں کے آٹھویں باب میں اپنے ذاتی اغراض کے لیے جھوٹ بولنے کو بہت بُرا بتایا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا ہے ۵

گر راست سخن باشی و در بند بانی بہ زان کہ در دغلت دہا ز بند بانی
بعض صاحبوں کی یہ رائے ہے کہ صورت مفروضہ میں بھی مقتضائے جو ائمہ دینی ہیں کہ جھوٹ نہ بولا جائے بلکہ ظالموں کا مقابلہ کر کے اپنے تئیں اُن مظلوموں پر تار کیا جائے جب اپنے میں سے کوئی باقی نہ رہے تب اُن مظلوموں کی باری آئے تو آئے۔ لیکن ہمارے نزدیک جہی تک جو ائمہ دینی ہیں کہ ظالموں کے مقابلے کرنے یا اپنی جان پر کھیلنے سے اُن بیگناہوں کی جان بچ جانے کا یقین کامل ہو ورنہ یہ حرکت تہوڑا اور زیادتی اور سفاہت میں شمار ہوگی ۶

اسی طرح شیخ کے اس شعر کے مضمون پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے ۵

شمشیر نیک را ہن بچوں کند کسے ناکس بہ تربیت نشود لے حکیم کس

کیونکہ اس سے لازم آتا ہے کہ تعلیم و تربیت اور قانون و مذہب اور تمام سیاستیں اور فضول اور بیکار ہیں۔ مگر یہ مسئلہ کہ تعلیم سے انسان کی جبلت بدل جاتی ہے یا نہیں۔ علم اخلاق کے ان مسائل میں سے ہے جن کا آج تک کسی قطعی دلیل سے فیصلہ نہیں ہوا۔ انگلستان کے روشن ضمیر مورخ کی رائے ہے کہ حال کی سولیزیشن نے انسان کے اخلاق پر اس کے ہوا کچھ اثر نہیں کیا کہ گناہوں کی صوتیں اور نام بدل گئے ہیں۔ مگر گناہ بدستور موجود ہیں۔ پہلے زمانے میں بیشک گناہ بہت سخت اور شدید اور صریح ہوتے تھے۔ لیکن بہت کم ہوتے تھے۔ اور اب اگرچہ ویسے شدید اور سخت گناہ نہیں ہوتے۔ لیکن نہایت کثرت سے ہوتے ہیں۔ اور جیسے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسی لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر بپاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائے تو بھی انسان اپنی جبلت سے نہیں ٹلے گا۔

ایک جگہ شیخ نے کہا ہے کہ ”یہودی کیسا ہی دولت مند ہو جائے شریف نہیں ہو سکتا“

فی الواقع اس سے کمال تعجب پایا جاتا ہے۔ مگر اس پر کوئی مذہب سے مذہب بھی اعتراض نہیں کر سکتا۔ ہر قوم اپنی حکومت کے زمانے میں محکوم قوم کو ایسا ہی سمجھتی رہی ہے۔ آریانے ہندوستان کے قدیم باشندوں کو اس سے بھی زیادہ حقیر سمجھا تھا۔ مسلمانوں نے بھی اپنے دورے میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھا اور انگریز بھی باایں برہمنائیت کی تہذیب نو بلٹی یا خرافت کو اپنی ہی قوم کے ساتھ محض جانتے ہیں +

ایک اور جگہ گلستاں میں لکھا ہے کہ اگلے زمانے میں ایک ملوین بادشاہ کے لیے چند حکماء یونان نے آدمی کا بچہ جو خاص صفات سے موصوف ہوا تجویز کیا تھا۔ مگر تجربہ کی

نوبت نہیں آئی۔ یہ بات حال کی تحقیقات کے برخلاف بتائی جاتی ہے۔ شاید ایسا ہی ہو۔ مگر شیخ اس اعتراض سے بری ہے۔ اس کا الزام جو کچھ ہے جو تین پر ہے نہ ان کی توجہ کے راوی پر شیخ پر البتہ اس صورت میں اعتراض ہو سکتا تھا۔ کہ وہ ان کی توجہ کو پسند کرتا یا یہ لکھتا کہ اس سے بادشاہ کو شفا ہو گئی۔ یا جو فرض معلمین اخلاق کا ہے یعنی ہر قسم اور افسانے سے ایک مفید نتیجہ استخراج کرنا اس سے عمدہ برآ نہ ہوتا۔

بعض تلمیذاء اعتراض بھی شیخ کے کلام پر مٹنے لگے ہیں۔ مثلاً اُس نے گلستاں میں کہا کہ:۔
”وہ راست برد اگرچہ دور است زن بیوہ مکن اگرچہ خور است“

اس پر بعض حضرات یہ نقص وارد کرتے ہیں کہ جس امر کی اجازت شریعت سے پائی جاتی ہے اس سے منع کرنے کے کیا معنی۔ اور بعضے کہ تلمیذ بیوہ کی جگہ بیوہ بتاتے ہیں جس کے معنی انھیں کو معلوم ہیں۔ یہ دیسا ہی اعتراض ہے جس پر کسی نے کہا تھا ”شعبر و بدو“ کہ تردید ظاہر ہے کہ شیخ کی کتاب گلستاں کوئی فقہ کا فتوے نہیں ہے کہ جس کے ہر امر و نہی کو امر و نہی مصطلح فقہ پر محمول کیا جائے۔ وہ اکثر اپنے تجربے اور رائے کے موافق جس بات کو نہی نوع کے حق میں مفید سمجھتا ہے اس کی ترغیب دیتا ہے اور جس کو مضر سمجھتا ہے اس سے منع کرتا ہے۔ گو فقہانے اس کو مباح لکھا ہو۔ کیونکہ مباحات میں فعل اور ترک دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے۔ یہی بات کہ شیخ کی رائے فی فقہ کیسی ہے سو حدیث نبوی سے بھی ابکار کی ترجیح ثقیبات پر ثابت ہوتی ہے۔

سب سے اوّل مقبول اعتراض بوستاں کی اس حکایت پر وارد ہوتے ہیں جس میں شیخ نے سؤمناں کا قصہ لکھا ہے مگر ہم نے اس کی بابت پہلے باب میں کچھ غور لکھے ہیں۔

بیوہ کے معنی اغت میں تہجد اور خیر ہونے کے لکھے ہیں جو اس مغوی کسی طرح چسپاں نہیں ہو سکتے۔

جن سے اعتراض کسی قدر ہلکے ہو سکتے ہیں *

اُردو پرستی کا ذکر جو ان کتابوں میں اکثر آیا ہے یہ بھی سخت اعتراض کے قابل بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر اس باب میں ہم نے کچھ خاتمہ کتاب میں لکھا ہے وہ شاید ان اعتراضوں کے فیصلے کے لیے کافی ہو *

ایسے ایسے اعتراضوں سے بچاے اس کے کہ ان کتابوں کی قدر و قیمت میں کچھ فرق آئے اور زیادہ ان کی عظمت ثابت ہوتی ہے۔ پکڑا جس قدر اُجلا ہوتا ہے اسی قدر جلد ذرہ سے دھبے سے میللا ہوتا ہے۔ ان کتابوں کا بھی یہی حال ہے۔ یہ کتابیں ٹھٹھے چھڑتو رہیں سے برابر تعلیم میں داخل رہی ہیں۔ اور آج کل بھی نہ نہایت نکتہ چینی کا ناز ہے اسی طرح مشرقی سلسلہٴ اقلیم کا جُزءِ اعظم ہیں ان کے ایک ایک فقرے اور ایک ایک مصرع کو نہایت غور سے دیکھا گیا ہے۔ مشنریوں نے صرف اس وجہ سے کہ ان میں مسلمانوں کی مذہبی باتیں بہت ملتی ہوئی ہیں۔ اور ایسے مضامین کا سلسلہٴ تعلیم میں داخل رہنا سن کے مقاصد کے برخلاف ہے۔ ان پر نکتہ چینی کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ اور گورنمنٹ میں پیش کرنے کے لیے بڑے ٹولانی ردیو لکھ کر چھپوائے ہیں۔ نیز اس لحاظ سے کہ ان کتابوں کو زیادہ تر صغیر سن بچے پڑھتے ہیں۔ اور بھی زیادہ چھان بین کی گئی ہے۔ باوجود ان سب باتوں کے ایسے چند سرسری اعتراضوں کا وارد ہونا جیسے کہ اوپر ذکر کیے گئے اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بلاشبہ اس قدر بے عیب ہیں جس قدر کہ نائن مینٹو میں انسان کا کلام بے عیب ہو سکتا تھا *

دوسری عام اور بڑی خوبی جو ان کتابوں کی خصوصیات میں سے ہے وہ شیخ کا انڈر لائن ہے جس کا لکھ اُس کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا تھا۔ یہ بات نہ قواعدِ علمِ بلاغت کی یا ہندی

سے حاصل ہو سکتی ہے اور نہ کسی اُستاد کی تعلیم سے آتی ہے۔ بلکہ جس طرح حُسن صورت اور حُسن سیرت قدرتی خوبیاں ہیں۔ اسی طرح حُسن بیان بھی ایک جبلی خاصہ ہے جس پر اکتساب کو چنداں دخل نہیں اور یہی وہ چیز ہے جس کی کمی اور زیادتی پر شاعری کا نقصان کمال موقوف ہے۔ جو مطلب اُس کو بیان کرنا ہوتا ہے اس کے لیے وہ ایسا دلکش لطیف پیرایہ ڈھونڈھ لاتا ہے جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں ہوتا۔ مثلاً عربی میں ایک قول مشہور ہے ”الْعَمَّتْ زَيْنَةُ الْعَالِمِ وَسَيَّرَ الْجَاهِلُ رَيْنِیَ خَامُوشِیَ عَالَمِیَ زینت ہے اور جاہل کی پر وہ پوش اس مطلب کو وہ شعر میں اس طرح بیان کرتا ہے

ترا خاموشی اے خداوند پوش وقار است و نااہل را پرده پوش

اگر عالمی بیست خود مَسْبَر و اگر جاہلی پردہ خود مَدَر

یا مثلاً اُس کو بیان کرنا ہے کہ جو لوگ نصیحت نہیں سننے وہ آخر کو کُچھتاتے ہیں یا زُک اُٹھاتے ہیں۔ اس مطلب کو وہ یوں ادا کرتا ہے ”ہر کہ نصیحت نشنود مہرِ ملامت شنیدن آید۔“ یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا ہے کہ ہر شے کی قدر اُس کے کم یا ب ہونے سے ہوتی ہے۔ اُس کو وہ اس طرح لکھتا ہے ”اگر شہما ہمہ شبِ قدر بودے شبِ قدر بے قدر بودے۔“ یا مثلاً اُس کو یوں بیان کرنا ہے کہ اپنے سے زیادہ علم والے سے مباحثہ کرنا ناوانی ہے۔ اس کو اس طرح بیان کرتا ہے ”ہر کہ بادا ناترے از خود مجاہدہ نماید تا بداند کہ دانا است بداند کہ ناوان است“ یا مثلاً اس مطلب کو کہ سب پیٹ کی خاطر سخی اُٹھاتے ہیں۔ وہ اس عنوان سے بیان کرتا ہے ”اگر جو شکم نہ بودے بیج مرغ درد ام نیفتادے بلکہ حیثاً و خود دام نہ نہادے۔“ یا مثلاً یہ بات کہ حاکم رشوت سے دھما ہو جاتا ہے۔ اس طرح بیان کرتا ہے ”ہم کس را دزدان ترشی کند گرد و مرقا ضیاں را بشیر نی“ یا مثلاً اس مطلب کو کہ ریا کے لیے لذتوں کو ترک کرنا بڑا ہے

وہ اس اسلوب سے ادا کرتا ہے۔ دیکھ کر ترکِ شہوت از بہر قبولِ خلق دادہ است از شہوتِ حلال در شہوتِ حرام افتادہ است، یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا ہے کہ کسی کی آہ و زاری سے قضا الہی نہیں بدلتی اور قانونِ قدرت نہیں ٹوٹتا۔ اس کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے یہ
 قضا اگر نشود و ر ہزار نالہ و آہ بہ شکر یا بہ شکایت بر آید از دہن
 فرشتہ کہ وکیل است بزرگ آباد چہ غم خورد کہ بمیرد چراغِ پیر زدن
 یا اسکو یہ کہنا ہے کہ اے ریاکاریہ دکھا دے کی عبادتِ تجھ کو خدا تک نہ پہنچائیگی۔
 اس مطلب کو دونوں ادا کرتا ہے ۵

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعلیٰ کیس رہ کہ تومی روی بترکتان است
 کبھی وہ ایک نصیحت کے مضمون کو جو اُس کو بیان کرنا ہے ایک واقعے کی صورت
 میں بیان کر کے اُس کو زیادہ پرتاثر اور دلنشین کر دیتا ہے۔ مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا
 کہ جس طرح ہم سے پہلے لوگ ہزار ہا امیدیں اور ارمانِ دل میں لیے ہوئے مر گئے اسی طرح
 ایک روز ہم تم بھی مر جائیئے اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے ۵
 شنیدم کہ یک بار در جبلا سخن گفت با عابد نے کلا
 کہ من قبرستان نہ ہی داشتم بسر بر کلا ہے بھی داشتم
 سپرم مدد کرد و نصرت وفاق اگر نعمت بیازوے دولت عراق
 قسَمِ کردہ بودم کہ کراماں خرم کہ ناگہ بخوردند کراماں سرم
 بکن چنبہ غفلت از گوشِ ہوش کہ از مُردگان پندت آید بگوشتش
 آخر کے شعر سے اس نے یہ بات بتادی ہے کہ حقیقت میں کوئی کھوپری نہیں ٹوٹی تھی بلکہ
 صرف ایک بیان کرنے کا پیرایہ ہے یا مثلاً اُس کو دکھانا منظور تھا کہ ہر شخص اپنے نہ ہونے کو

اور دوسرے کے مذہب کو باطل سمجھتا ہے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے ۵

یہ کہ جنہو دو مسلمان خلاف می جیتند چناں کہ خندہ گرفت از نزاع ایشان
بر طہر گفت مسلمان گراں قبالہ من درست غیبت۔ خدا یا جنود میرانم
جنود گفت بہ توریت می خرم سوند و گر خلاف کنم ہجرتو مسئلہ انم
گرا دسبیطر میں عقل مندم گرد بخود گمان نہ بردہ چسپس کن نادانم

یہ مطلب اگر ایک جلد میں بیان کیا جائے تو بھی اتنا مؤثر اور دلاویز نہیں ہو سکتا۔
جیسا کہ اس پیرائے نے اس کو دلاویز اور مؤثر کر دیا ہے۔ یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا
کہ اسن اور عافیت اسی میں ہے کہ انسان لوگوں کے قصے جھگڑوں سے علیحدہ رہے اور
خود داری کو ہاتھ سے نہ دے اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے ۵

دوکس گرد دیدند و آشوب جنگ پر آگندہ غسلین و ترندہ سنگ
یکے فتنہ دید از طرف بر شکست یکے در میاں آمد و سر شکست
کسے خوشتر از خوشیتن دار نیست کہ با خوب و زشت کش کار نیست

یا مثلاً اُس کو یہ لکھنا منظور تھا کہ جو شخص اپنا کام چھوڑ کر دوسروں کے کام میں دخل دیتا ہے
ایک بڑی جواب دہی اپنے ذمے لیتا ہے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح ادا کرتا ہے ۵

اں شنیدی کہ صوفیہ می گوشت زیر غسلین خویش میخے چند
استینش گردنت سرہنگے کہ بیان غسل پرستورم بند

اس میں پیرائے بیان کے علاوہ صوفی کی تخصیص کرنے سے شوخی اور ظرافت بھی انتہا درجے
کی بنتی ہے۔ یا مثلاً اُس کو لکھنا تھا کہ بھیک مانگنا ایک مذموم خصلت ہے اس کا الزام صرف
فقیروں پر ہی نہیں بلکہ دولت مندوں پر بھی ہے۔ اس مطلب کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے

”خواہندہ مغربی درصفت بڑا زانِ حلب می گفت اے خداوندانِ نعمت اگریشارا انصاف
 ہوئے و ما را قناعت رسم سوال از جہاں برخاستے ”یا مثلاً یہ بیان کرنا مقصود تھا کہ تواضع
 انکسار سے عزت اور مرتبہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے ۷

یکے قطرہ بارانِ زابرے چکید جھل شد چو پیناسے دریا بدید
 کہ جا بے کہ دریاست من کیستم گرا و ہست حشا کہ من نیستم
 چو خود را بہ چشمِ حقارت بدید صدف در کنارش بجاں پرورید
 پہریش بجائے رسانید کار کہ شد نامور کو لوے شاہوار
 بلند می ازاں یافت ٹوپست شد در نیستی کوفت تا ہست شد

یا مثلاً اُس کو یہ بیان کرنا تھا کہ جس طرح پارسا لوگ رندوں کی صحبت سے منقبض ہوتے ہیں
 اسی طرح رند لوگ پارساؤں کی صحبت سے گھبراتے ہیں۔ اس کو وہ اس طرح بیان کرتا ہے ۷

نرا بدے در میانِ رنداں بود زان میاں گفت شاہے بلخی
 گر ملولی ز ماثرش منشیں کہ تو ہم در میانِ تالخی
 کبھی وہ اپنے ہی کلام کو ادر کا مقولہ قرار دے کر نہایت باغزہ کر دیتا ہے جیسے ۷

دو بیتم جبکہ کرد و زے کباب کہے گفت گویندہ بار یاب
 درینا کہ بے مابے روزگار بڑوید گل و بشکفہ نو بہار
 بے تیر و دے ماہ وادے بہشت بیاید کہ ما خاک با شیم خوش

یا جیسے ۷

چو دخلت نیست خج آہستہ تر کن کہے گویند ملاحاں سرودے
 مگر بلداں بہ کوہستانِ نبارد بسالے دجلہ گرد و خشک رودے

یا جیسے ۵

ہچمچاں در فکر آں بیتم کہ گفت
پیلہا نے برب دریاے نیل
زیر پایست گردانی حالِ نور
ہچو حالِ تست زیر پایے پیل

یا جیسے ۵

چہ خوش گفت با کودک آموزگا
کہ کارے نہ کردیم و شد روزگار

یا جیسے ۵

اں شنیدی کہ شاہے بنفت
بادل از دست دادہے گفت
تا ترا تہ بخوشتن باشد
پیش چشمت چہ قدر من باشد

۳۔ ان دونوں کتابوں میں یہ بات بھی تعجب انگیز ہے کہ باوجودیکہ صنائعِ لفظی و معنوی ان میں کثرت سے موجود ہیں اور تقریباً نصف گلستاں کے فقرے صحیح اور متفق ہیں بایراج و دسادگی میں ضرب المثل ہیں اور جہاں شرماری کا ذکر آتا ہے وہاں سب سے پہلے گلستاں کی مثال دیجاتی ہے۔ فی الواقع یہ شیخ کے کمالِ انشا پردازی کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ شاعر اور منشی جب الفاظ کی دیاوہ رعایت کرتا ہے تو اس کے کلام میں خواہاں خواہی بناوٹ اور تکلف پیدا ہو جاتا ہے اور سرشتِ رخصن معنی ہاتھ سے جاتا رہتا ہے شیخ نے صنائعِ لفظی و معنوی کو ایسی خوبصورتی اور سلیقے سے برتا ہے کہ کہیں ساختگی اور تصنع کا گمان نہیں ہوتا۔ مگر وہ ان عارضی نمائشوں کا ایسا پابند نہیں ہے کہ ان کے لیے فصاحت و بلاغت سے دست بردار ہو جائے۔ جہاں الفاظ مساعت کرتے ہیں وہاں ایک ہلکی سی چاشنی اس کی بھی دیدتیا ہے۔ اس کی شریں مسجع اور مضع فقرے سارے فقروں میں ایسے لے ہوئے ہیں جیسے پٹینے کی مثال میں ریشم کے تار جب تک خاص توجہ سے نہ دیکھا جائے

تمام فقرے یکساں اور ہوا معلوم ہوتے ہیں البتہ بعض حکایتوں میں اُس نے صناع
لفظی و معنوی کی زیادہ رعایت کی ہے۔ جیسے ساتویں باب کی ایتیسویں حکایت جس میں
اپنا اور ایک شخص کا مناظرہ تو نگری اور درویشی کے باب میں لکھا ہے۔ مگر اُس میں بھی
الفاظ کو حسن معنی میں خلل انداز ہونے نہیں دیا۔ جس قدر اس حکایت کے الفاظ میں
تناسب اور حسن انتظام پایا جاتا ہے اُس سے زیادہ خیالات میں سنجیدگی اور مصلحت
واقعیّت موجود ہے۔ حکایت مذکور کے چند متفرق فقرے بطور نمونے کے یہاں نقل کیے جاتے ہیں۔
”تو نگراں دخل مسکینا نند۔ و ذخیرہ گوشہ نشیناں۔ و مقصد زائراں۔ و کعب مسافرین۔
و محمل بارگراں از بہر راحت دگراں۔ دست بطعام انگہ بزند کہ متعناں و زبرد ستاں بخورد
و فضیلت مکارم ایشان بہ ارباب و ایام و پیراں و اقارب و جیزاں برسد۔۔۔ از مدہ غالی
چہ قوت آید و از دست تہی چہ قوت زاید۔ و از پاس بستہ چہ سیر آید۔ و از دست گرنہ چہ بچیز
فراغت با فاقہ معنی پیوندد۔ و جمعیت با ننگہ ستی صورت زبندد۔ یہ تحریر عشا بستہ و دیگر
منظر عشا نشستہ ایں بلاں کے مانند۔۔۔ اشارت خواجہ عالم بقبر طائفہ ایست کہ مرد
میدان رضا نند۔ و تسلیم تیر قضا۔ نہ ایناں کہ خرقہ ابرار پوشند۔ و لقمہ اوارا نوشند۔۔۔ بشمول
کفایت از دولت عفات محروم است۔ و ملک فراغت زیر نگین رزق معلوم۔۔۔ گفت
چندال بانند در وصف ایشان بکروی۔ و سخنا سب بریشان بگفتی کہ وہم تصور کند ترانہ
یا کلید خانہ ازاق شستہ مشکب و مغرور۔ و محب و نفور۔ مشغول مال و نعمت۔ و مفتن
بماہ و خروت سخن نگویید الا بسفاست و نظر نکنند الا بہ کراہت۔ علما را بگدائی منسوب کنند
و فقر ارا بہ سرو پائی میوب گردانند۔ بغزت مالے کہ دارند و غیرت جاہے کہ ندارند۔ بزرگان

لے و نشان۔۔۔ اس بات کے ہیں کہ یہاں کچھ فقرے ہموار دیے گئے ہیں +

ہمہ نشینند۔ و خود را بہتر از ہمہ شناسند۔ نہ آن در سر دارند۔ کہ سر کیسے فرو دارند۔ بجز از قول
 خلق کہ گفتہ اند۔ ”بہر کہ بطاعت از دیگران کم است و بہمت بیش۔ بصورت تو اکثر است
 بمعنی درویش“۔۔۔ گفتم نہت ایشاں رواندار کہ از خداوندان کرم اند، گفت غلط کردی
 کہ بندگان درم اند چہ فائدہ کہ ابراؤر اند و بر کس نمی بارند۔ و چشمہ آفتاب بند و بر کس نمی تابند۔
 و بر مرکب استماع سوار نہ دینی را نہ۔ و قدسے بہر خدا نہ منند۔ و درے بے حق و
 اذے نہ منند۔ ہاے بہشت فرام آزند۔ و بہشت نگہدارند و بہشت بگذارند۔ چنان کہ
 بزرگان گفتہ اند۔ ”بہر کہ حق وقتے از خاک بر آید کہ بخیل بجا کہ در آید۔۔۔ گفتمش بہر بہشت
 خداوندان نہت و توفیق یافتہ الا بعلت گدائی۔ و گرنہ بہر جمع کیسہ نہ کریم و بچہ بیش
 نماید۔ محکم و اند کہ در عیبت و گداوند کہ نمسک کیست۔۔۔ محال عقل است کہ اگر یک
 بیاباں در شود جنم گدایاں پیر شود۔۔۔ بہر زویدہ دست و دماغ بہر کنت بستہ با بعلت بیوایی
 در زنداں نشستہ۔ یا پرودہ معصومے و یدہ۔ یا کفے از مشنم بریدہ۔ الا بعلت درویشی
 شیر مرداں را بجا کم ضرورت و لقب ہا گرفتہ اند و غیب ہا سفتہ۔۔۔ اغلب تیرہ ستاں این
 عصمت بمعیت آلایند و گرسنگاں نام مردم را بایند بعیت

چوں سلب آرزو گوشت یافت نہ پیرسد کیس شیر صلح است یا خرد و جال
 گفتا نہ من بر حال ایشاں رحمت می بزم۔ گفتم نہ کہ بر مال ایشاں حسرت می خوری
 بہر بنیت کہ برا نہے بدفع آں کو شیدے و ہر شاہے کو خا اندے بہر نریں پوشیدے
 تا نقہ کیست بہمت در باخت۔ و تیرہ جیہ حجت ہمہ بنیاخت۔۔۔ بہر جا کہ گل است خار است و باغ خواہ
 و بر سر تیغ مار و آہا کہ در شاہاوت۔ ہنگ مردم خوار۔ لذت عیش و نیا را لذتہاں در پیش
 و نیم بہشت را دیوار کارہ در پیش۔۔۔ نظر کنی در نبتاں کہ میر خشک است و جوب خشک۔

بچپن میں در زمرہ تو نگراں شاکر مذکور۔ و در حلقہ دور ویشاں صابرند و بنجور... بمقر بان
حضرت حق جل و علا تو انگراند و دریش سیرت و در ویشاں تونگر مہمت۔ مبین تو نگراں
آنست کہ غم در ویشاں بنجور و ویشاں آں کہ کمر تو نگراں گیرد... نعم
طائفہ ہستند برین صفت کہ بیاں کردی تھانہ صفت و کافر نمست۔ کہ بیزد و بنہند و بنجورند
نہمند... قومے برین طائفہ ہستند کہ شنیدی۔ و طائفہ خوان نمست نہادہ و صلاستہ کرم و داد و
میان بجزرت بستہ و ابرو تواض کشادہ۔ طالب نام اند و مغفرت۔ و صاحب دنیا و آخرت۔
سم شیخ اکثر ان کتابوں میں ایسی حکایتیں لکھتا ہے جن میں باوجود موعظت بائج کے
کسی قدر ظرافت و خوش طبعی کی بھی گنجائش ہو۔ پھر اپنے حسن بیان سے تمام حکایت کو نہایت
طبیعت و طبع کرویتا ہے۔ اوکبھی وہ ایک سیدھی سادی حکایت میں کوئی گرم فقرہ با لطیف کنایہ
ایزا کر کے اُس میں خون مچا دیتا ہے تاکہ چند موعظت کی تلخی ظرافت کی چاشنی سے دُور
ہو جائے۔ چنانچہ گلستاں کے خاتمے میں اُس نے لکھا ہے :

”غالب گفتار سعدی طرب انگیز است و طیب آئینہ۔ و کوئے نظاں را برین علت زیر طبع
دراز کہ مغز دماغ بیوہ ہر دوز و دود چہر غایب فائدہ خوردن کا برخود منداں نسبت۔“ لیکن بر
یائے روشن صاحب دلاں کہ کوئے سخن در انشاں است پوشیدہ نماند کہ دُر موعظت با صافی
و رسلک عبارت کشیدہ است و دواز دسے تلخ نصیحت بشہد ظرافت آمیزتہ تا طبع علواناں
دولت قبول محروم نماند جو ظرافت اُس نے بوستاں اور گلستاں میں برتی ہے وہ اکثر نہایت
سنجیدہ اور معقول ہے۔ البتہ کہیں کہیں اُس کے علم سے ایسے الفاظ بھی ٹپک پڑے ہیں جو قانون
محرّم و حرام سے کسی قدر تجاوز کریں۔ لیکن ایک نظر لطیف اور شیخ مزاج آدمی کا ایسے الفاظ سے
بچنا اُسی سوسائٹی میں ممکن ہے جس میں مرد عورت تقریباً تمام جہوں میں شریک

ہوتے ہیں اور جہاں مرد عورتوں کی محبت اور ان کے تعلیم یافتہ ہونے کے سبب
 ہمیشہ تحریر و تقریر میں زبان قابو میں رکھنی پڑتی ہے۔ ورنہ طبیعت کی غوغا ایک ایسی
 پیڑ ہے جو بغیر سخت مزاحمت کے کسی طرح رک نہیں سکتی۔

نکوڑو تا سب مستوری ندارد جو در بندی سرازر وزن بر آرد
 اس قسم کی چند حکایتیں مثال کے طور پر یہاں لکھی جاتی ہیں:-

مثال ۱۔ مہمان پرے بودم در دیار یک کمال فراواں داشت دفرزندے خوش
 شے حکایت کرد کہ ”مراد عہہ عمر جز نرس فرزند بنودہ است دختے دیں وادی زیارت گاہ
 کہ مرداں بجا بت خواستن آجی روزہ شہماے دراز در پائے آں درخت حق نالیدہ ام
 تاہم ایں فرزند بخشیدہ کشنیدم کہ پسرش بار فقاں ہی گفت سپہ بودے اگر من آن دخت
 بدارستے کہ کجاست تا دعار دے کہ پدرم زہ و تربید“ خواجہ شادی کتاں کہ پسر م
 عاغل است و پسر طمنہ زن کہ پدرم فروشت لا نیقل قطعہ

سالمہ سار تو بگذر و کہ گذر نہ کنی شوے تربت پدرت

تو بجائے پر چہ کردی خیر تا ہماں چشم داری از پست

مثال ۲۔ پیر مردے را حکایت گفت کہ دخترے خواستہ و حجرے گل آراستہ و بخلت باو
 نشہ و دیدہ و دل درو بستہ شہماے دراز غفٹے و بذر با و بطیغنا گفتے، باشد کہ نوشت پیر
 دشت نگید۔ بالجلہ شے ہی گفت ”بخت بلندت یار بود چشم دولت بیدار کہ بہ محبت پرے
 افتادی، پختہ پرورہ جہان دیدہ آریدہ یک دیہ جہاں آرمودہ۔ سرود گرم روزگار چشیدہ
 کہ حق محبت ہاند و شرط محمودت بجا کرد مشفق و مہرباں۔ خوش طبع شیریں زبں۔ شتوی
 تا تو انہم دولت بدست اکر م و رہبازار ایم نیسا زار م

در جو طوطی بود مشغول خورشید جان شہری خداے پرورش
 نہ گرفتار آمدی بدست جوئے محبت - غیره راسے سرخیز شیک پایے کہ بدوم ہوئے بچہ
 و ہر شب جائے خنید - و ہر روز یارے گیرد قطعہ

جو انان خرم اند و خوب رخسار و لیکن در وفا با کس نپایند
 وفاداری مدار از لب لال چشم کہ ہر دم بر نگلے دیگر سسایند
 بر فلان پیراں کہ عقل و ادب زندگانی کنند - نہ بمقتضای جمل و جوانی میت
 ز خود بہترے جوے در صفت ثناء کہ با چوں خودے کم گنی روزگار
 گفت چنداں کہ بریں خط بگفتہ گاں بزم کہ دیش در قیدین آمد و رسیدن شد ناگاہ نشے
 سر و ازل پروردگار و دو گفت - کہ چندین سخن کہ گفتی در بار و سے عقل من دزل آں یکہ
 سخن نثار و کہ وقتے شنیدہ ام از قابلاہ خویش کہ گفت زن جوان اگر تیرے در پہلو نشیند یکہ
 فی الجملہ امکان ہوا وقت نبود بفاقت - اینجا مید چوں مدت بدلتش بسر آمد عقد کا شستہ
 با جوانے شہر ترش روستے بہمدست - باخوے - جو رو چنامے دید و بچ و عنای کشید و شکر
 نعمت حق بچناں می گفت کہ الحمد للہ از ان عذاب الیم بر سیدم و بایی نعمت مقیم - سیدم قطعہ

باتو مرا شوختن اندر عذاب یہ کہ شدان یاد رے در بہشت

یوے پیاز از دہن خوب روستے خوب تر آید کہ گل از دست زشت

مثال ہم - مرا حاجیے شاد عاج زاد کہ رحمت برا خلاق محبت ج باد

شنیدم کہ بارے سگ خواندہ بود کہ از این بونے داس ماندہ بود

بمید اختم شد کاں استخوان نے بایدم دیگر سگ مخاں

مپندار چوں سہر کہ خود خورم کہ جو رحمت را و تہر سہر آبزم

تقاضا کُن اے نفس براند کے کہ سلطان دور دیش بینی کے
 چرا پسش خسرو بہ جت زوی چو یک سونسادی طبع خسروی
 یہاں پہلی بیت کے دورے مصرع میں محنت کا لفظ کنایہ بجائے نصرت اور اُس کے
 مرد و افاد کے لایا گیا ہے۔ کیونکہ شعرا کے نزدیک حاجیوں کی سنگ دلی قساوت تکبر
 وغیرہ صفات ذمہ سلم ہیں۔ چنانچہ گلستاں میں بھی شیخ نے ایک جگہ لکھا ہے۔ ۵
 از من گویے حاجی مردم گزاسے را کو پوستان غلغلی بازار می درو
 حاجی تو ہستی شترست از برے آنکہ بیچارہ حناری خورد و باری برد
 بابک اور شاعر کہتا ہے ۵

چوں مائلے کہ دل زور بخا جمع کرد حاجی ستم بہ خلق خدا بنیہ کند
 پس ظاہر ہے کہ جو شوخی اس کنایہ میں ہے۔ وہ صراحت میں ہرگز ممکن نہ تھی۔ اکثر ناقدین
 لوگ اس جگہ رحمت کو اپنے حقیقی معنی پر محمول کرتے ہیں۔ مگر حکایت کا مضمون جس سے
 رویت اور شکایت پائی جاتی ہے حقیقی معنی سے اُپا کرتا ہے ۶

مثال ۴-۱۲۔ ہزر گانے را دیدم کہ صد و پنجاہ شتر بار داشت۔ و چیل بندہ ہندو
 شے در جزیرہ کیش مرا بہرہ خورد خویش برد۔ وہم شب نیارمید از سختمائے پریشاں گفتن کہ فلان
 انبارم ہر کستان است۔ فلان بضاعت ہندوستان۔ وایں قباہ و فلاں زمین است۔
 و فلاں مال را فلاں کس نہیں، گا ہے گھنے کہ خاطر اسکندریہ دارم کہ ہوایش خوش است۔ وہاں کہتے
 نہ کہ دریائے عرب متوش است۔ بعد اس سفر کے دیگر درپیش است۔ اگر آں کردہ شود بقیت عمر
 بگوشتہ بغیرم گفتم آں کلام سفر است۔ گفت ”گوگرد یا رسی بہ میں خواہم بردن کہ شنیدم کہ غیرت
 عظیم دارد۔ و انراں جا کا شہ چینی بودم برم۔ و دیبا کے رومی ہندو دیو لاد ہندی بہ طلب۔

و آگینہ بلبی بزمین - و بر دیوانی بیارس - ازال پس ترک شکر کنم و بد کلمات نشینم و چون اس کے
 انیس با یخو یا فرو گفت کہ بیش طاقت گفتش نما ند گفت سعدی تو ہم سخنے بگوارا
 کہ ویدی و شنیدی - گفتم قطعہ

اس شنیدستی کہ وقتے تاجرے
 گفت چشم تنگ دنیا دارا
 مثال ۵ - ہلک صلح از بادشاہان
 بگفتے در اطراف بازار کوئے
 کہ صاحب نظر بود در ویش دوست
 دو در ویش در مسجدے غفہ نیست
 شب سروشاں دیدہ نابردہ خواب
 یکے زان وومی گفت با دیگرے
 گرایں بادشاہان گردن فراند
 در آیند با عاجسہاں در شبیت
 بہشت بریں ہلک ماواست
 ہمہ عمر از ایناں چہ ویری ہشی
 اگر صلح آں جا بدو ارباب
 چہ امر دایں سخن گفت و صلح ہشی
 دے رفت ناچشمہ آں ب
 ز دال ہر د کس را فرستاد و خود

و بر بیابانے بغیت داد ستور
 یا قناعت چہ کند یا خاک گور
 بدوں آمدے صبح دم یا غلام
 بر سیم غریب نیمہ بر بستہ رُوس
 ہراں کس دودار و ہلک صلح آوت
 پریشاں دل و خاطر آشفتہ یافت
 چو حر باتا مل کنتاں آفتاب
 کہ در روز شش روز داورے
 کہ در ہمو و عیشش اند با کام دناز
 من از گور سہر بزمی ہم نخست
 کہ بند غم امر و زہر پاک ماست
 کہ در آخرت نیز زحمت کشی
 در آید کفشت زش بدرم دماغ
 دگر بودن آں جا مصباح ندیر
 ز چشمہ خالہ نہشت - خواب
 بہیت نشست و بخت نشاند

برایشاں سب سارید بارانِ خود
 پس از بخی و سز و باران و سیل
 گدایان بے جامہ شب کردہ روز
 یکے گفت از ایناں ملک ایناں
 پسندید گاں در بزرگی رسند
 شهنشہ ز شاہی جو کل بر شکفت
 من آن کس نیم کہ غرور چشم
 تو ہم با من از سر بہ خوب زشت
 من امر و زکردم در صلح باز
 چنینس راہ گر متقبلسی پیش گیر
 بزاز شاخِ الو بجائے کسے بر نہاشت
 ارادت نداری سعادت جوے
 ترا کے بود چون سپر رخ التہاب
 وجو دے دہر و دشمنائی جمیع
 وہ اکثر نہایت پاک و اولطیف نکلتے جن سے عموماً اذان خالی ہوتے ہیں ایسی معمولی

اور سرسری باتوں سے نکال لیتا ہے جو عام ذہنوں میں موجود ہوتی ہیں :

مثال ۱۔ ہر نفسے کہ فردی کو دو مقدمات است: چوں برے اندفع فوات۔ پس در ہر
 نفسے دو نعمت موجود است: دہر نفستے شکرے و حبیب۔ یہ بات کہ داخلی اور خارجی دونوں خاص
 انسان کی زندگی اور تفریح کے باعث ہیں، سب کو معلوم تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ہر ایک

کا شکر ادا کرنا چاہیے مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ ہر سانس میں زندا کا شکر کرنا واجب ہے +

مثال ۲۔ جو عقل ہانڈروں دار دار ہو چکا کہ چہ شبت زرش بیش چہ شبت خاک

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ کچھ حرص اور طمع سے پاک ہوتا ہے اور یہی معلوم تھا کہ اس کو سنو نے اور مٹی میں کچھ تمیز نہیں ہوتی۔ مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ سنو نے اور مٹی کو برابر جانتا جو کہ اعلیٰ درجے کے عرفاء اور خدا رسیدہ لوگوں کا منصب ہے۔ بچے کو گویا فقط حرص اور طمع سے پاک ہونے کے سبب حاصل ہے کہ نہ کہ سنو نے اور مٹی میں کچھ فرق نہ کرنا اس پر بھی تک باقی رہتا ہے جب تک حرص اور ہوس پر راسخ نہ ہوتی۔ پس ایک شاعرانہ فلسفی پختہ نکال سکتا ہے کہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں +

مثال ۳۔ ازال کرڈ تر سد ترس اسے حکیم دگر با جو اد صبر برائی بجاگ

ازاں مار بریا سے راغی زند کہ تر سرد سر شمس را بکو بدیناگ

یہ بات سب جانتے ہیں کہ کبھی کبھی عاجز اور زیر دست بھی زبردستوں پر بنا کر جاتے ہیں اور سانپ کا وار بھی کبھی کبھی چرواہے پر نل جاتا ہے۔ مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ جو اپنے سے ڈرے اُس سے ڈرنا چاہیے۔ کیونکہ عام خیال یہ ہے کہ جو اپنے سے ڈرے اُس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں +

مثال ۴۔ وہ کہ گر مردہ باز گردید کے ۱ بنیان قبیلہ وہیوند

رو میراث سخت تر بودے و ارشاں از مرگ خویشاوند

یہ بات سب کو معلوم تھی کہ میراث بہت عزیز چیز ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ مرگ غریب سخت مصیبت ہے مگر یہ نکتہ مخفی تھا کہ اگر مردہ پٹا کر آتا تو داروں کو میراث کا دینا دینا اُس کے ماتم کے رخ سے زیادہ سخت اور ناگوار ہوتا +

اسی طرح وہ نہایت سرسری اور معمولی سرگزشتوں سے ایسے اور اچھوتے نتیجے نکال لیتا ہے جو ہم و گمان میں نہیں ہوتے۔ مثلاً یہ کہ میرے باپ نے بچپن میں مجھ کو ایک انگوٹھی پہنا دی تھی۔ ایک روز ایک شخص نے ایک کھجور دیکر مجھ سے وہ انگوٹھی لے لی۔ چونکہ بچہ انگوٹھی کی قدر نہیں جانتا اس لیے ذرا سی مٹھاس کا لالچ دیکر اُس سے لی جاسکتی ہے پس جو لوگ عمر کو عیش شیریں میں برباد کر دیتے ہیں شاید وہ عمر کی قدر نہیں جانتے، یا مثلاً ایک بار عید کے دن باپ کے ساتھ عید گاہ میں گیا۔ اتفاقاً خلقت کے هجوم میں باپ سے پھیر گیا۔ میں اُسی حالت میں رُورہا تھا کہ باپ نے آکر دفعتاً میرا کان مروڑا اور فرمایا: ”میں نے تجھ کو بارہا کہا ہے کہ میرا دامن پکڑے رہا کر تو نہیں مانتا،“ سچ ہے جس طرح انجان بچہ اپنے آپ رستہ نہیں چلا سکتا۔ اسی طرح سالک بغیر مشائخ اور کاملین کی دستگیری کے منزل مقصود پر نہیں پہنچ سکتا، یا مثلاً میرے جسم میں کپڑوں کے اندر ایک زخم تھا شیخ علیہ الرحمہ ہمیشہ پوچھتے تھے کہ کیسا ہے مگر یہی نہ کہتے تھے کہ کہاں ہے اُس سے میں نے جانا کہ ہر عضو کا نام لیا روا نہیں ہے۔ یا مثلاً ایک شخص نے اپنے بیٹے کے کان اُٹھ کر کہا کہ درنا لایق! میں نے تجھ کو کھلاڑی لکڑیاں چیرنے کو دی تھی، مسجد کی دیوار ڈھانے کو نہیں دی تھی، اسی طرح زبان ذکر اور فکر کے لیے بنی ہے لوگوں کی غیبت کرنے کے لیے نہیں بنی۔ یا ایک شخص مٹی میں سنا ہوا مسجد میں جانے لگا۔ دوسرے نے اُس کو چپک دیا کہ خبردار جو مسجد میں قدم رکھا، میرا دل یہ بات سن کر بھر آیا کہ افسوس بہشت میں بھی جو ایک پاک جگہ ہے دامن آلودہ لوگ نہ جاسکیں گے۔

۶۔ حسن تاویل اور لطیف استدلال جیسا کہ چچا اُٹا اُس کے کلام میں پایا جا:

ہے۔ ایسا اور شعرا کے کلام میں نہیں دیکھا گیا +

مثال ۱۔ شنیدی کہ در دروز کا قدیم شدے سنگ دست ابدال سیم
 نہ پنداری ایس قول معقول نیست جو قانع شدی سیم و سنگت کیست
 یعنی جو مشہور ہے کہ اگلے زمانے میں ابدال کے ہاتھ میں چتر چاندی ہو جاتے تھے۔ اس
 کوئی بات عقل کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ جو لوگ قانع ہوتے ہیں ان کے نزدیک پیراؤ
 چاندی میں فرق نہیں ہوتا۔ ایک امر فارق عادت کس حسن بیان کے ساتھ کیسے
 مختصر لفظوں میں عادت کے موافق ثابت ہوتا ہے ؟

مثال ۲۔ رہ عقل جز پنج در پنج نیست
 توان گفتن ایں با حقائق شناس
 کہ پس آسمان وز میں چیستند
 پسندیدہ پر سیدی اسے ہوشمند
 کہ ہامون دوریا و کوہ و فلک
 ہمہ ہرچہ بستند زان کمتر اند
 عظیم ست پیش تو دوریا و پنج
 وے اہل صورت گما پے بزند
 کہ اگر آفتاب است یک ذرہ نیست
 چو سلطان عزت عسک بر کشد
 یہاں اس نے وحدت وجود کے اصلی معنی جو کہ اہل فطرت سمجھتے ہیں : لا ترقی نہیں سچے
 بلکہ ایک اور معنی جن کو ہر شخص تسلیم کر سکتا ہے نظم میں ایسی لطافت اور خوبی سے بیان
 کیے ہیں کہ کوئی اور نثر میں بھی مشکل سے بیان کر سکتا ہے ؟

مثال ۳۔ نگہدار فرصت کہ عالم دے است دے پیش وانا بہ از عالمے است
 سکندر کہ بر عالمے حکم داشت در اں دم کہ بگذشت و عالم گذشت
 میستر بود و دشمن کزو عالمے ستا خند و فرصت و ہندش دے

یہاں اُس نے دو مقنا دو عوے کیے ہیں۔ ایک یہ کہ عالم ایک سانس کا نام ہے۔ دوسرا یہ کہ ایک سانس عاقل کے نزدیک عالم سے بہتر ہے۔ پھر دونوں دعووں کو ایک دلیل سے ثابت کیا ہے۔ کیونکہ جب ایک سانس کے نہ آنے سے تمام عالم سکندر کے ہاتھ سے جاتا رہتا تو معلوم ہوا کہ اسی سانس کا نام عالم تھا اور جب کہ ایک سانس اُس کو تمام عالم کے عوض میں مل سکا تو معلوم ہوا کہ ایک سانس تمام عالم سے بہتر تھا۔ یہاں تاہج کا حسن استدلال ہے کہ دو مقنا دو عوے ایسی مختلفہ بیانی اور اختصار اور وضاحت کے ساتھ ایک ہی دلیل سے ثابت کیے جائیں اور جن شعر بھی ہاتھ سے نہ جائیں چھینچر کے بیان میں شیخ کا کلام فی الواقع لائق ہے۔ خدا کی صنعت اور حکمت کے تعلق وہ وہی دہیں بیان کرتا ہے جو سب جانتے ہیں۔ لیکن یہ کسی کی طاقت نہیں کہ اُن کو ویسے پاکیزہ اور دل نشیں بیان کے ساتھ ادا کر سکے۔ اُس کے بچوں بیان پر غالب مرحوم کا یہ شعر صادق آتا ہے۔ شعر

دیکھنا تقریر کی لذت کو جو اُس نے کہا میں نے یہ جاننا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
 مثال ۱۔ گرد حق نہ توفیق خیرے رسد کے از بند خیرے پر خیرے رسد
 زبان را چسبہ بینی کہ استر ادا یہ میں تازباں را کہ گفتار واد
 در معرفت دیدہ آدمی است کہ بکشادہ بر آسمان دریں است
 کینت فہم بودے نشیب و فراز گراں در نہ کردے بر دے تو باز
 سر آور دو دست از عدم در وجود دریں بخود بہنا دو در دے سجود

وگرنہ کئے از دست بخود آمدے محال است کہ سر سجد آمدے
 بجگت زباں داد و گوش آفرید کہ باشند صندوق دل را کلید
 اگر نہ زباں قصہ برداشتے کس از سیر دل کے خبر داشتے
 وگرنہ سہمی جائسوس گوش خبر کے رسیدے بہ سلطان ہوش
 مرا نیک شیرین خوانندہ داد ترا سميع و زاک دانندہ داد
 مام ایں دو چوں حاجباں بزرگ ز سلطان بہ سلطان خبرے بزند
 چہ اندیشی از خود کہ فعل کمکوست ازاں در نگہ کن کہ تقدیر اوست
 برد بویستاں باں یا یوان شاہ بہ تحفہ شرمس ز یوان شاہ

اس نظم میں اُس نے یہ بات بیان کی ہے کہ بدون خدا کی توفیق کے آدمی سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور زبان۔ کان۔ آنکھ۔ سر اور ہاتھ جن ظاہری اغراض کے لیے پیدا کیے گئے ہیں وہ اغراض بیان کی ہیں۔ یہ تمام باتیں کم و بیش ہر شخص کو معلوم ہوتی ہیں مگر جس ترتیب سے شیخ نے ان کو بیان کیا ہے اُس کے لحاظ سے تمام مضمون نرا معلوم ہوتا ہے۔ اخیر بیت میں انسان کی بندگی اور عبادت کو باغبان کی ڈالی سے جو کہ بادشاہ ہی کے باغ میں سے بادشاہ کے لیے لگا کر لے جانا ہے تشبیہ دیکر مضمون کا حسن انتہا کو پہنچا دیا ہے۔

مثال۔ دو صد تہہ در یک درختست کہ گل تہہ چوں تو پر داخت است
 رگت در تن است لے پسندیرہ خوش نہینے و روی عدو قصت چوسے
 بھر در سرو منکر ہر اسے و تیز جواج بدل۔ دل بد دانش عزیز
 بہایم جزو اندرافت اوہ خواہ تو جموں الفت بر قدس سوا
 مگوں کردہ ایشان سر از بہر خود تو آری بغیرت خورشین شیش سر

مثال ۳۔ شب از بہر آسایش خست و روز
کہ سحر جز بطاعت منہ و دآوری

عبا از برائے تو قرآن و آتش دار
مہر روشن و مہر گیتی فروز

آریا و دیر است و باران و صبح
ہے گستر اندلس با طہار

ہمسہ کار داران منہاں بربد
و گر تشنہ مانی ز سختی مجوشش

ز خاک آورد رنگت بوسے و طعام
عسل و ادوت از نخل و متن از ہوا

ہمد نخل بند اں بجایست دست
خور و ماہ و پرویں برائے تواند

ز خارت گل آورد و از نافہ مشک
برست خود چشم و ابرو گاشت

توانا کہ آں ناز نہیں پرورد
بجائ گفت باید کفن بر کفن

۴۔ وہ اکثر قانون قدرت سے اشیاء کے حسن و قبح اور اُصول اخلاق کے ثبوت پر
استدلال کرتا ہے اور ایسا استدلال ہمیشہ دیگر اقسام استدلال کی نسبت زیادہ دلنشیں اور عام فہم ہوگا۔

کلام الہی میں بھی مبدا و معاد کے ثبوت پر زیادہ تر ایسی قسم کا استدلال کیا گیا ہے +
مثال ۱۔ پلیدی کند گریہ بر جابے پاک

تو آزادی از ناپسندی ہا

چو زشتش گماید بر پوشد بجاگ

ز تموی کہ بروے فست دید ہا

ہائی کو جو قدرت نے یہ بات سلکھائی ہے کہ وہ جہاں کہیں لوہل و براز کرتی ہے اُس کو نورِ اُمّی سے ڈھانک دیتی ہے۔ اس سے وہ اس بات پر استدلال کرتا ہے کہ بڑے اعمال کو ہمیشہ لوگوں سے چھپانا چاہیے جو ایسا نہیں کرتے وہ ایک جانور کے برابر ہی سمجھ نہیں لکھتے +

مثال ۲۔ علمِ شترِ خُیاں کہ معلوم ہست اگر طفلے ہمارش گیر دو صد فرسنگ پیرِ گردن از متابعت او نہ چید۔ انا اگر اسے جو ناکِ پیش آید کہ موجبِ ہلاک باشد و طفلِ آنجا نادانی خواہ رفتن ز نام از کفش درگسا اند و بیش متابعت نہ کند کہ نہ گام در شتی طلاطفت مذموم ہست قطعہ کسے کہ لطف کند با تو خاکِ پایش باش و اگر ستیزہ کند در دو چشمش افکن خاک سخن بہ لطف و کرم با درشت خوئے مگو کہ زنگ خوردہ نگر و دگر بسوئیاں پاک

یہاں اُس کو یہ سوجھنا منظور تھا کہ نرمی وہیں تک پسندیدہ ہے جہاں تک نرمی طرف سے درشتی اور سختی اور اپنی مضرت کا احتمال نہ ہو ورنہ مذموم ہے۔ اس مطلب کے وہ یہ دلیل لاتا ہے کہ اونٹ کو بھی قدرت نے یہ بات سلکھائی ہے کہ جب تک کچھ خطرہ نہیں ہوتا ایک بچہ اُس کی نیل پکڑ کر جہاں تک چاہتا ہے پہنچاتا ہے مگر جہاں کچھ خوف ہوتا ہے وہاں اُس کی اطاعت نہیں کرتا اور رستی ٹھاکر بھاگ جاتا ہے +

مثال ۳۔ برہ بریکے پیشم آمد جواں بہ تنگ در پیش گو سفندے دواں بد و گفتم ایں رسیان است و بند کہے آء داند رپیست گو سفند چپ و راست پوئیدن آغاز کرد کہ جو خوردہ بود از کف مرد و خید مرادید و گفت اے خداوند برکے چو باز آمد از عیش و شادی بکا کہ ایں رسیاں سے بزو با منش

بہ نطفے کہ دیدار است پسِل دہاں نیار دہے حملہ بر پیلہاں
 براں را نوازش کن اے نیک مر کہ سگ پاس دار و چنان تو خور
 بر آں مرو گند است دندان یوز کہ مالہ زباں بر پیرشش دوروز
 یہاں اُس کو یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جس قدر تم لوگوں کے ساتھ احسان اور بھلائی
 کرو گے اسی قدر لوگ تمہارے دوست اور خیر خواہ و جاں نثار ہونگے پس یہ وہ دلیل لایا ہے
 بکری۔ ہاتھی۔ گنا۔ چیتا اور اسی طرح تمام حیوانات کو قدرت نے یہ بات سکھائی ہے کہ
 جو شخص اُن کی پرورش کرتا ہے اور اُن کو کھلاتا پلاتا ہے وہ اسی کا دم بھرنے لگتے ہیں
 یہاں تک کہ وحشیوں میں وحشت اور درندوں میں شہیعت باقی نہیں رہتی *
 ۴۔ وہ کبھی فقیہانہ اور واعظانہ نصیحتیں جو اکثر تمخ اور بے فزہ اور سامعین کے
 دل پر گراں ہوتی ہیں نہیں بلکہ آزادانہ و محققانہ نصیحتیں کرتا ہے جو اگرچہ عام خیالات
 سے کسی قدر بلند ہوتی ہیں۔ لیکن عد شرع سے ہرگز متجاوز نہیں ہوتیں اور اس لیے
 اُن کو زائد اور رند و نول پسند کرتے ہیں *

مثال ۱۔ بہ سرنگ سلطان جنم گفتن کہ خیزاے مہارک در رنق زن
 پروتا ز خوانت نصیب دہند کہ فرزند گانت بہ سخی درند
 بگفتا بود بطبع امر و سرور کہ سلطان بشب نیت روزہ کرد
 زن از نا امید می سر انداخت پیش بھی گفت با خود دل از فاقہ ریش
 کہ سلطان ازین روزہ کوئی چہ نداشت کہ افکار او عجب طفلان ماست
 خورندہ کہ خیرش بر آید دوست یہ از صایم الدہر دنیا پرست
 مسلم کسے را بود روزہ داشت کہ و ساندہ ہا دہر تان چاشت

دگر نہ چہ حاجت کہ ز حمت بری ز خود باز گیری و ہم خود خوری
 مثال ۲۔ شنیدم کہ مردے براہِ حجاز بہر خطوہ کردے دو رکعت نماز
 چناں گرم زدو در طیق خدے کہ غارِ مغیلاں نہ کندے زباے
 بہ آخر زو سواسِ خاطرِ پریش پسند آمدش در نظر کا خوش
 بہ تبلیس ابلیس و چاہ رفت کہ نتواں ازین خوشتر راہ رفت
 گریش ز حمت حق نہ دریافتے غورش سر از جاوہ تر یافتے
 کیے ہالت از غیب آواز داد کہ اے نیک بختِ بارک ہناو
 بہ سندانِ گر طاعتے کردہ کہ ترے بریں حضرت آوڑہ
 بہ احسانے آسودہ کردن دے یہ از الف رکعت بہ منزلے

۱۰۔ جب اُس کو کسی خاص فرقے یا جماعت کے واقعی عیوب بیان کرنے ہوتے ہیں تو اُن کو ایسے عمدہ پیرایوں میں بیان کرتا ہے کہ کسی کو ناگوار نہیں معلوم ہوتے۔ مثلاً اُس کو یہ منظور تھا کہ اُمراء اور دولتمندوں کو اُن کے عیوب سے مطلع کرے تو اس طلب کو صاف صاف نہیں لکھا بلکہ ایک فرضی منظر اور ایک اور شخص کا جس میں اپنے تئیں اُمراء کا ظہور اور اپنے حریف کو فقر اور درویشیوں کا حمایتی قرار دیا ہے، لکھ کر تمام دل کے خیالات ظاہر کیے ہیں۔ طرف ثانی میردوں کی بُرائیاں اور درویشوں کی خوبیاں بیان کرتا ہے۔ اور شیخ اس کی تقریر کو رد کر کے اُمراء کی خوبیاں اور درویشوں کی بُرائیاں ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح اُس نے تمام سلاطین و عہد اور دُزرا اور اُمراء کی خاطر خواہ خبر لی ہے چنانچہ گستاخوں کے ساتویں باب میں یہ منظرہ موجود ہے۔ یا مثلاً اُس کو خضائع دُزبا کی طبعی کمزوری منظور تھی اس معنیوں کو اُس نے کلمہ کھلا ادا نہیں کیا۔ بلکہ ایک قصہ جو ہستیاں کے

چوتھے باب میں مذکور ہے، نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک شیخ چشم سائل کسی بزرگ کے دروازے پر بھیک مانگنے گیا۔ صاحب خانہ کے پاس اُس وقت کچھ نہ تھا اس لیے کچھ نہ دیا۔ سائل نے ڈیڑھ می سے ذرا پرے ہٹ کر اُس کی اور اُس کے ساتھ تمام فقر اور شاخ کی تفتیح اور توہین کرنی شروع کی اور خوب دل کے بخارات نکالے جتنے واقعی عیب کثر ان لوگوں میں ہوتے ہیں سب ظاہر کر دیے۔ جب شیخ صاحب اُن کے پترے کھول چکے تو سائل کے بیان کو اپنے اس مقولے پر ختم کرتے ہیں ۵

”سخن اہم دریں باب ازیں بیش گفت کہ شفت بود سیرت خویش گفت“

یعنی میں اس باب میں اس سے زیادہ کہنا نہیں چاہتا اور نہ وہی مثل ہوگی۔ اپنا کھٹنا کھو لیے اور آپ ہی لاجوں مرے کیونکہ آپ بھی ماسی گروہ میں سے ہیں پھر اُس بزرگ کی تواضع اور کھٹل اور مل کا بیان کیا ہے کہ! وجود ایسی دہاں و رازیوں کے اُس نے کچھ بُرا نہ مانا اور اُس کے گمان سے زیادہ اپنے محبوں کا اقرار کیا +

۱۱۔ یہ بات عموماً دیکھی گئی ہے جو واقعات اسلاف سے نقل کیے جاتے ہیں وہ ہاتھ نہ تر نہیں ہوتے، ہننا کہ اپنی سرگزشت ملہر و داد کا بیان نہ تو تر ہوتا ہے لہٰذا طبعک بیان کرنے والا نہایت فصیح و بلیغ اور اپنے جذبات ادا کرنے پر قادر ہو۔ کیونکہ جو روایت ایک واسطے سے سنی جاتی ہے اُس کا یقین بہ نسبت اُس روایت کے زیادہ ہوتا ہے جو متعدد واسطوں سے سنی جائے۔ دوسرے ناقل اپنی سرگزشت کو بہ نسبت خجانیہ کے زیادہ پر جوش الفاظ میں بیان کر سکتا ہے۔ گلستاں اور بوستاں میں چونکہ شیخ نے زیادہ تر اپنے ہی واقعات نقلے ہیں اور ان سے نتائج استخراج کیے ہیں۔ اس لئے اُن کا زیادہ تر ہوتا ہے اور ناظرین کو زیادہ پسند آنے ہیں۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ

شیخ جیسا جاو بیان آن کو بیان کرتا ہے ایسی مثالوں سے دونوں کلامیں بھی
 ہوئی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے :

مثال ۱۔ بھنا دم ہٹلے اندر گزشت چہ گویم کز انم چہ بر سر گزشت
 قضا نقش یوسف جامے نہ کرد کہ ماہٹے گوش چو یونس غورد
 دریں باغ سروے نیام بلند کہ بادا جین غمش از بھی نہ کند
 عجب نیست بر خاک اگر گل قلعنت کہ چندیں گل انعام در خاک طعنت
 ہل نعمتم اے ننگ مرداں میر نگر کو ملک زود پاک و آلودہ پیر
 نمود او آشفتگی زندہ شش بر آمد محتم شگے از مرگ شش
 زہولم صاں جاے تمک و تنگ بشورید حال و بگردید رنگ
 چو باز آدم زان تغیر بہ ہوش زمسہ ز نذر لبندم آمد بہ گوش
 گرت وحشت آمد تاریک جاے بخشش باش و بار و شنائی ہر آب
 شب گور خواہی منہر چو روز ازیں جاچہ رخ عسل برفرد
 تن کار کن مے بلرزہ دعب مبادا کہ غفلت نیل بعد طب
 گرد ہے منداواں طلع کن بزند کہ گندم بعتنا زندہ حسیر من بزند
 بڑاں خورد سعدی کہینے نشانہ کسے بزد حسیر من کہ تخف نشانہ

۱۲۔ جب اس کو کسی نیک کام کی ترغیب دینی ہوتی ہے تو ایسے غریب اور اجنبی
 مباحث پیش نہیں کرتا۔ جو لوگوں کے خیالات میں بہت کم گزرتے ہیں بلکہ ایسی معمولی
 باتیں یاد دلانا ہے جو اس کام کی نسبت ہمیشہ خاص و عام کے دل میں زرتی ہیں اور
 ان کی آنکھوں کے سامنے پیش کی جاتی ہیں۔ اور جب کسی امر پر اس کو متنبہ کرنا منظور

ہوتا ہے تو ایسے صبر اور صاف نتیجے سوجھاتا ہے جو دنیا میں ہمیشہ دیکھے جاتے ہیں وہ کوئی نئی بات نہیں رکھاتا۔ بلکہ بھولی ہوئی باتوں کو یاد دلاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس بیان کی طرف خود بخود لوگوں کے دل کھینچتے ہیں اور اس کے کلام میں ایسا مزہ آتا ہے جیسے کوئی مدت کی کھائی ہوئی لذیذ چیز برسوں کے بعد سامنے آتی ہے اور نہایت رغبت اور خوق سے کھائی جاتی ہے۔

مثال ۱۔ پدر مرده را سایہ بر سر فلک
چو بینی تینے سر انگندہ پیش
عبارش بیفشان و خارش بکن
مدہ بوسہ بر رُوے فرزند خویش
یتیم از بگریہ کہ نازش خرد
الامانہ گریہ کہ عکسش عظیم
بر رحمت بکن آیش از دیدہ پاک
اگر سایہ او برفت از سرش
من آنکہ سہر تا جورد اشتہ
اگر برو جودم نشستہ تمس
کنوں گر بزنداں بر ندیم اسیر
مرا باشد از درد طغلاں خبر
مثال ۲۔ پسر چوں زد دہر گدشتش من
بر پنبہ آتش نشاید ز رخت
چو خواہی کہ نامت بماند بجای
کہ گر عقل و ادبش نباشد بے

عبارش بیفشان و خارش بکن
مدہ بوسہ بر رُوے فرزند خویش
و گر خشم گیرد کہ بارش بر دہ
بلرز دہے چوں بگریہ تیسیم
بشفقت بیفشان از چہرہ خاک
تو در سایہ خویش تن پرورش
کہ سرور کنار پردہ اشتہ
پریشاں شدے خاطر چند کس
نبا شد کس از دوستانم نصیر
کہ در طغلی از سر برستم پدر
ز نامحسراں گوشت را ترش
کہ تا چشم بر ہم زنی خانہ سوخت
پسر را خرد مدی آموز و راے
بمیر می و از تو نمنا ند بے

بسا روزگار کہ سختی برد
 خردمند و پرہیزگار شش برآمد
 بخروی درش زجر و تسلیم کن
 نو آموز را ذکر و تحسین دزد
 بیاموز پروردہ را دست رنج
 مکن تکیہ برد تنگاہے کہ هست
 پسایاں رسد کیسہ بسم دزد
 چہ دانی کہ گردیدن روزگار
 چو بر پیشہ باشدش بستر س
 ندانی کہ سعدی مکان انچه یافت
 بخودی بخور د از بزرگان قفا
 ہر آن طفل کچو را آموزگار
 پس را نکو دار و راحت رساں
 ہر آن کس کہ منہ زند را غم نخورد
 نگہدار ز آئینہ نگار بدش
 پسرو میان قفس در نشست
 درغیش مخور بر ہلاک و تلف
 پس چوں پر رنار کش برد
 گرش دوست داری بنادش مدار
 بر نیک و بدش وعدہ و بیم کن
 ز تونج و ہمتدیر استاد بہ
 و گردست داری چو قاروں برنج
 کہ باشد کہ نعمت نماند بہت
 نہ گرد و تہی کیسہ پیشہ دور
 بعنہ رب بگرداندش در دیر
 کجا دست حاجت برد پیش کس
 نہ ہاموں نوشت و نہ دریا شگفت
 خدا دادش اندر بزرگی صفا
 نہ بیند جفا بیند از روزگار
 کہ چشمش نماند بہست گناں
 دگر کس غمش خورد و آوارہ کرد
 کہ بد بخت و پہلے رہ کند چوں خودش
 پرہ گو، ز خیرش ز دستوے دست
 کہ پیش از پروردہ بہ ناخلف

یہ خصوصیتیں چ کلستان اور بوستان میں ہم نے بتائی ہیں زیادہ غور کرنے سے اور بھی بہت سی
 باتیں ایسی نکل سکتی ہیں جو ان کتابوں کی مزید شہرت اور قبولیت کا باعث ہوئی ہیں مگر
 ہم انہیں پر اقتصار کر کے اب شیخ کی غزلیات پر نظر ڈالتے ہیں +

غزلیاتِ شیخ

غزلیات کی ترتیب کا طریقہ جوں اور اوستا فارسی اور اردو دیوانوں میں صیج جیسے طریقے پر غالباً سب سے اول شیخ ہی کا دیوان مدون کیا گیا ہے۔ کیونکہ شیخ سے پہلے کے بعض دیوان غزلیات مثل خاقانی وغیرہ اب تک مجموعہ قصاید کی طرح غیر مرتب اور پراگندہ طور پر لکھے ہوئے ملتے ہیں +

علی بن احمد بے ستون جامع کلیاتِ شیخ نے اول ہر ایک غزل کے مطلع کا حرف لیکر شیخ کے تمام دیوانوں پر ترتیبِ حروف تہجی جمع کیے تھے۔ آخر اس ترتیب میں یہ تصاحف نکلی کہ جس غزل کا مطلع معلوم نہ ہو اُس کا دیوان میں بلنا دشوار تھا۔ چنانچہ شیخ کی صفات کے بالائیں برس بعد اُس نے دوبارہ شیخ کے سب دیوان موجودہ ترتیب پر مرتب کیے اور پھر یہ ترتیب عموماً جاری ہو گئی +

شیخ کی غزلیات کے جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا چار دیوان ہیں جن میں سب سے بڑا دیوان موصوم بہ طبقات ہے۔ باقی تین دیوان اس سے چھوٹے ہیں۔ اگرچہ ان میں بعض دیوان ابتدا سے عمر کے اور بعض سنِ کموت کے اور پیری کے زمانے کے ہیں مگر شیخ کا انداز بیان ابتدا ہی سے نقل میں ایسا صاف اور سلیس ہے کہ چاروں دیوانوں میں اعتبار صفائی اور سلامت کے بہت کم تفاوت محسوس ہوتا ہے۔ شاعر کے کلام میں ہمیشہ صفائی اور گھلاوٹ ایک وقت کی مشق و مہارت کے بعد آتی ہے۔ عفو ان شباب کا کلام ویسا صاف اور شستہ نہیں ہوتا جیسا سنِ کموت اور بڑھاپے کا ہوتا ہے مگر شیخ کا کلام اس سے

مستثنیٰ ہے۔ البتہ طبیبات اور بدائع جو جوانی اور کمولت کے زمانے کے دیوان ہر اُن میں اور دیوانوں کی نسبت خیالات کی تراکت اور زور بیان زیادہ پایا جاتا ہے +
 شیخ کے دیدن کو اکثر تذکرہ نویسوں نے نکدانِ شعر لکھا ہے۔ مگر جس سے پہلے انوری و خاقانی و ظہیر وغیرہ کی غزلیات موجود تھیں اور قدما کے قصاید میں بھی مثلِ ستاخرین کے اکثر تشبیہوں میں تغزل یعنی عاشقانہ اشعار ہوتے تھے۔ مگر اُس وقت غزل میں یہ لذت نہ تھی۔ جو شیخ نے اپنی جادو بیانی سے پیدا کی پہلے شاعری کا مادہ زیادہ تر قصیدہ اور مثنوی پر تھا۔ یعنی دویتی (یعنی رباعی) اور قطعہ کے سوا اور کچھ نہ کہتے تھے +

شیخ نے غزل کو ایسا رنگین اور با مزہ کر دیا کہ لوگ قصیدہ اور مثنوی کو چھوڑ کر غزل پر ٹوٹ پڑے۔ غزل گویوں کے نام یا تو انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے یا لاکھوں سے متجاوز ہو گئے۔ اسی واسطے بعض شعرا نے شیخ کو غزل کا پیر کہا ہے مگر کلام کی نمکینی اور شیرینی محض وجدانی کیفیتیں ہیں جو بہ دن ذوقِ سلیم کے ہر گو معلوم نہیں ہو سکتیں پس صرف یہ کہہ دینا کہ اُس کا دیوان نکدانِ شعر ہے یا وہ غزل کا پیر ہے انھیں کیسے کافی ہے جو شعر کا پورا پورا مذاق رکھتے ہیں۔ سن کے سوا اور لوگ جب تک کوئی شیخ یا لا مبیانہ شیخ اور قدما کی غزل میں بیان نہ کیا جائے یہ نہیں سمجھ سکتے کہ شیخ کی غزلیات کو کیا نوعیت ہے لیکن جدیدانیات میں فرق بتانا کچھ آسان کام نہیں ہے +

میں نے شیخ اور انوری و خاقانی و ظہیر کی غزلیات کو صرف اِس غرض سے دیکھا کہ وہ تفاوت جو شیخ اور قدما کی غزلیات میں ہے۔ صاف صاف معلوم ہو۔ مجھ کو جو چند باتیں شیخ کے دیوان میں ایسی ملی ہیں جو قدما کے کلام میں یا تو بالکل نہیں یا بہت کم پائی

جاتی ہیں۔ میرے نزدیک یہی وہ خصوصیتیں ہیں جنہوں نے غزل کو نہایت بامرہ اور طعنت انگیز اور مرغوب طبائع خاص و عام کر دیا ہے +

۱۔ شیخ اکثر غزل کی بحر اور زمین ایسی اختیار کرتا ہے جو تغزل اور تغنی کے واسطے بہت مناسب ہوتی ہے۔ نظم میں سب سے بڑا کرشمہ جو کہ اکثر اُس کو نثر سے زیادہ و لفریب اور دلکش کر دیتا ہے وزن اور قافیہ ہے۔ پس ظاہر ہے کہ شگفتہ زمین اور مضمون کے مناسب وزن اختیار کرنے سے نظم کی و لفریبی زیادہ ہو جائیگی۔ اسی لیے شیخ کی غزلیات ابتدا سے وجد و سماع کی مجلسوں میں گائی جاتی تھیں۔ علی بن احمد جامع کلیات شیخ جس نے شیخ سے ۴۲ برس بعد اُس کا کلام جمع کیا۔ اپنا مشاہدہ لکھتا ہے کہ ایک جگہ رات کو مجلس سماع منعقد تھی جس میں شیخ کی یہ غزل گائی گئی تھی ۷

نظر خدا ہے بیناں ز سر پر خوانا شد سفر نیاز مند اداں ز رہِ خطا ناستد
مجلس کے خاص و عام جا بجا بیہوش اور خود فراموش پڑے تھے اور مجلس کے برخواستہ ہونے کے بعد سب کا اس بات پر اتفاق تھا کہ مدتِ عمر میں ایسا سماع نہیں دیکھا +
میں کہتا ہوں کہ ایک باریں نے بھی ایک بزرگ کو جو سماع سے ہمیشہ پرہیز کرتے تھے شیخ کے ایک مطلع پر جو قوال نے بے فرامی کے اُن کے سامنے گایا تھا دیکھا کہ اُن کا تمام بدن کانپنے لگا تھا۔ اور آنکھوں سے برابر آنسو جاری تھے۔ اور یہ کیفیت اُن پر بہت دیر تک طاری رہی تھی۔ وہ مطلع یہ تھا:-

اے کہ آگاہِ عالم درویشاں را توجہ دانی کو چہ سوداؤ سرست ایناں؟

۲۔ شیخ کی غزل کو اُس جلی حشوق و محبت نے جو اُس کی بات بات سے شکیلی

ہے اور بھی زیادہ چمکا دیا تھا۔ عرب اور عجم کے تمام شعرا جو عاشقِ مزاج ہوئے ہیں

اُن کی تشبیب و تغزل میں ایک خاص حالت پائی جاتی ہے۔ جو اوروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ شیخ ایک جگہ خود فرماتے ہیں ۵

اَس کہ نشید است ہرگز نوبے عشق گو بہ شیراز آؤ خاک مایہ پوسے

یہی سبب ہے کہ وہ حسن و عشق و وصل و جدائی۔ یاس و امید۔ صبر و مجبوری۔ وعدہ و انتظار اور دیگر لوازم عشق کی جو کیفیتیں بیان کرتا ہے اُن میں بالکل قصص نہیں پایا جاتا۔ اور وہ سب ایسی باتیں ہوتی ہیں جو اُس عالم میں ہر شخص پر گزرتی ہیں۔

اسی واسطے عشاق کے دل پر اُن کا زیادہ اثر ہوتا ہے۔ ایسے اشعار سے شیخ کے چادروں دیوان بھرے پڑے ہیں مگر چند شعر بطور نمونے کے یہاں لکھے جاتے ہیں :

مقدارِ یارِ ہم نقشِ چوں من نہ اندیچ کس ماہی کہ در خشک اوقند قیمت بد اند آب را

اے کہ غمتی ہیچ مشکل چوں فراقِ یار است گرائید وصل باشد اَس چنان دشواریست

ہر کو بھمہ عرش سوداے گلے بودہ است داند کہ چہ را بلبل دیوانہ بھی باشد

دل و جانم بہ تو مشغول دگر بچہ رست تا بد اند رقیباں کہ تو منظور مینی
دیگراں چوں برونند از نظر ازل برونند تو چنان در دل من رفتہ کہ جانِ بدنی

گفتہ بودم کہ رخت پر بندم تارہ بھسہ گیرم و بھسداو
دست از دامنم کنے دارد خاکِ شیراز و آبِ زکنا باد

ہزار جہد بکردم کہ تیر عشق بچو شتم بنود بر سر آتش میسرم کہ بخوشتم
بہ زخم خوردہ حکایت کنم ز دستِ حیات کہ تدرست مدامت کند چمن بجز دشتم

فحاتِ صبحِ دانی ز چہرہ دے دوستِ ارم
کہ چہرے دوستِ ماند کہ بر افکند نعلابے
بر دے گداہے سبکیں نصیبے و گر طلب کن
کہ ہزار بار گفتی دنیا مدت جوابے
شر بہتے تلخ تر از دردِ فراقِ باید
تا کند لذتِ وصل تو زاموش مرا

بر عند لیبِ عاشقِ گر بشکنی قفسِ را
از ذوقِ اندرونش پرواے در نہاںند
برقِ یمانی بجست بادِ ساری بجاست
طاقتِ مجنوں نہ از حیرتِ لیلی کجاست

۳۔ اکثر وہ ایسے شعر کہتا ہے جن سے مفہوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص موقع ہے اور
وہاں جو حالت اس نے انگموں سے لکھی ہے یا جو کیفیت اس کے دل کی گندی ہے اس کو
بیان کرتا ہے۔ اس قسم کے اشعار اکثر ایسے موقعوں پر جہاں تاسی طرح کی کیفیت
پیش آتی ہے نہایت مزہ دیتے ہیں۔ مثلاً

لے رو بہک چرائش سستی بجائے غولیش
باشیرِ خجہ کردی و دیدی سزا بے خوش
سارباں آہستہ راں کلامِ جانِ محلِ است
اشتراں را بارِ بر پشتِ است و لہا بولِ است

چہرے است اینکہ پیشِ کارِ است
مگر شمعِ بدستِ ساربانِ است
سلیمانِ است گوئی درِ عمارِ
کہ بر بادِ صبا تمنتش روانِ است
دروے کارِ من برقعِ بر اندخت
بیک بار آں کہ در برقعِ خانِ است
شتر بیشی گرفت اوسنِ بوقتِ
کہ بر من پیشِ ازاں بارِ گرانِ است
ہمارے سارباں محلِ زمانے
کہ عہدِ وصلِ حاکمِ زمانِ است

یا رہا رفتادہ را در کارِ واں گند آفتند
بے وفایداں کہ بر بستند بارِ خوش را
ہر کہ را در خاکِ غمیتِ پاسے در گلِ نازند
گو گو در خوابِ خوشِ تنید و یا بر خوش را

پیوندِ روح می کنند این بادِ مشکینہ ہنگامِ نوبتِ صبحت سے زخمِ سینہ
شاہدِ بخوان و شمعِ بسوزان و گلِ سنہ عینِ بہار و نمودِ بسوزانِ دگلِ برنو

خادمہ سر سے راگو درِ حجبہ بند کن تا ہر سحر حضورِ بارہا نہرِ موسیٰ
۴۔ وہ اکثر حالات و واردات کو جو اُس کے دل پر گزرتی ہیں تمثیلات میں
بیان کر کے کلام کو نہایت دلنشین اور بلند کرتا ہے۔ اس قسم کی تمثیلات حکیم سنائی
اور مولانا روم کے کلام میں بہت پائی جاتی ہیں۔ مثلاً

ہر گنجِ شایگانِ افتادہ بودم ندائسم کہ در گنجِ اندامِ ماں

اے برادرِ ما بہ گردابِ اندریم واں کہ غفلت می زند بر ساحلِ است

رُطَبِ شیرین و دستِ از غلِ کوتاہ زالالِ اندامِ میان و تشنہ محو

استادِ کیمیا را بسیار زرباید ور خاک تیرہ کہن تا آئندہ بہشد

۵۔ شیخ کی غزل میں باوجود کمالِ سادگی اور صفائی کے اکثر تراکت اور چہلچلایا
جاتا ہے۔ جس سے قہ ماکِ غزلِ مُعترَا معلوم ہوتی ہے وہ ایک سیدھی سی بات کو ہیر پھیر کر ایسے
لطیف اور خوشنما پیرایے میں ادا کر دیتا ہے جس کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ سنگریزوں کو
ترتیب دے کر موتیوں کی لڑی سے زیادہ خوشنما اور گراں بہا بنا دیتا ہے۔ مثلاً

بود ہمیشہ پیشِ ازیں رسمِ تو بیکینہ کنی از چہ مرا نئے کنشی من چہ گناہ کردہ ام

خلق را بیدار باید بود ز نابِ چشمِ من میں عجب کساں وقت می آید کہ کس بیدار

من نہ دانستم از اول کہ تو بے مروتی عہدِ نابستنی ازاں بہ کہ بر بندِ یونپائی

دوستاں عیبِ کتدم کہ چہ اولِ بوداوم باید اول تو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

گفتہ بودم چو بیائی عنہم دلِ با تو بگویم چہ بگویم کہ عنہم از دلِ برود چو نتوبائی

من آن نیم کہ حلال از حرام نشناسم شراب باتو حلال است و آب بے تو حرام
 اس خاصیت میں شیخ کی غزل سے جو نسبت قدما کی غزل کو ہے اُس کا انداز شیخ
 کے چند اشعار کا مقابلہ قدما کے اشعار کے ساتھ کرنے سے ہو سکتا ہے چنانچہ
 اس مقام پر دو دوشعر خاقانی اور انوری کے اور اُن کے ہم مضمون اشعار شیخ
 کے دیوان سے نقل کیے جاتے ہیں :-

انوری - رُوے چوں ماہِ آسمان داری سعدی - سرورامانی ولیکن سرور از قدسیت
 قد چوں سر و بوستان داری ماہِ رامانی ولیکن ماہِ راقعنا نیست
 ایضاً - ہمہ با من جفت کند لیکن ایضاً - قادری برہر چہ می خواہی بجز آزارِ من
 بجفت ایسیج از و نیازام زان کہ گزشتہ شیر بر فرم زنی آنا نیست
 خاقانی - بہرست چہ شیم دایم کہ نظر دریغ داری ایضاً - ہمہ چشیم تا برون آئی
 بہرست چہ گوئیم دایم کہ خبر دریغ داری ہمہ گوئیم تا چہ فرمائی
 ایضاً - شاد باش از خونِ دگر و صفتِ حلال ایضاً - ہر دم از شاخ زبا غم میوہ ترمیرد
 طبع خاقانی بہ نظم آورد و دیوان تازہ کرد بوستانہ راستہ زان تخم کہ در دل کاشتی
 ۶۔ سب سے بڑی بات جو شیخ اور قدما کی غزل میں ماہِ امتیاز ہے اور جس کے سبب
 اُس کے دیوان کو نمکدان شعر کہا گیا ہے - وہ یہ ہے کہ شیخ کی غزل کا عمار زیادہ رمضان
 مندرجہ ذیل پر ہے - تصوف اور درویشی عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پیرائے میں
 ادا کرنا اور شاہدِ مطلق کے شیون اور صفات کو زین و خال و خط و لہجہ و نثر و غیرہ سے
 تعبیر کرنا - کا ملین اور عرفا اور مشائخ پر، رند - بادہ خوار - میسر و نش - پیر خرابات کے الفاظ
 اطلاق کرنے اور اُن کے حالات اور واردات کو شراب و نغمہ و دوت و جنگ و غیرہ کے

لباس میں ظاہر کرنا۔ سلوک اور فقری کے مدارج و مقامات یعنی صبر و رضا تسلیم و توکل و قناعت وغیرہ کو نئے نئے عنوان اور اسلوب سے بیان کرنا۔ محاسب و زائد و فقیہ اور ایسے لوگوں پر جو مذہب کی رُو سے محلِ ادب ہیں، طعن و تعریض کرنی اور غیر مشترع اور آزاد لوگ جو از رُوئے مذہب مستحلِ نعمت و مذمت ہیں ان کی خوبی ظاہر کرنی۔ دُنیا کی بے ثباتی اور انقلابات کو طرح طرح سے جتاننا۔ ماصحوں کی نصیحت سے نفرت اور رُسوائی و بدنامی کی رغبت ظاہر کرنی۔ عقل و دانش کی جا بجا توہین۔ اور عشقِ مجازی کو عشقِ حقیقی کا زینہ قرار دیکر اس کی تعریف کرنی۔ ساقیِ مُطرب کو بار بار پکارنا اور اُن سے شراب و نغمہ کا اس لیے طلبگار ہونا کہ دُنیا کے تعلقات سے انقطاع میسر آئے۔ بادِ صبا اور نسیمِ سحری اور بُوے گل کو اکثر مخاطب کرنا۔ اور اُن کو قاصد و پیغامبر ٹھیکر اپنی آرزوئیں اور مُرادیں اور حسرتیں اُن سے بیان کرنی وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام عنوان ہر شخص کو مرغوب ہوتے ہیں مثلاً عشقِ حقیقی کی واردات اور کیفیات عشقِ مجازی کے پیرائے میں بیان کرنی۔ اور زلف و خال و خط سے شائد مطلق کی شیون اور صفات مُراد یعنی زیادہ دلکش اور مؤثر ہیں بہ نسبت اسکے کہ کھلی سُر پٹھ گائی جائے یعنی عشقِ حقیقی کو صاف صاف اس طرح بیان کیا جائے جیسے اونے دوجے کے شاعر یا موزوں طبع مولوی اور داعظ نظم میں توحید و مناجات وغیرہ لکھا کرتے ہیں حضرت مولانا مہزوم علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ۵

خوشر آں باشد کہ سترِ دلبراں گفتہ آید در حدیث و دیگران
 اسی طرح داعظِ اہم شیخ۔ قاضی۔ مصطفیٰ۔ محاسب اُمداور ایسے اشخاص کو جن کی

مذہب میں تعلیم کی جاتی ہے۔ ریاکاری اور مکر اور سالوس وغیرہ کے بہانے سے
 لٹاڑنا اور خود آدابش اور حسن پرست و بادہ خوار لوگوں کو اُن کی صاف بطنی مکر کو
 اور بے ریائی کی وجہ سے تعریف کرنی بہ نسبت اِس کے کہ رندوں کو ملامت کی جائے اور
 تشیع لوگوں کی تعریف کی جائے زیادہ مزیدار ہے اور زیادہ توجہ سے سنا جاتا ہے +

اگرچہ ان میں سے بعض عنوان جہتہ خستہ قدما کی غزل میں بھی پائے جاتے ہیں
 لیکن شیخ کے ہاں اول تو کثرت سے ہیں اور دوسرے اُس کے حسن بیان نے
 اُن کو بہت باعزہ اور لطیف انگیز کر دیا ہے +

شیخ کے بعد اول حضرت امیر خسرو اور میر حسن دہلوی نے اس خصوصیت میں
 شیخ کا متبع کیا ہے۔ کیونکہ شیخ نے اپنے چاروں دیوان جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے
 مکتان میں خاں شہید کے پاس جس کے ہاں امیر خسرو نوکر تھے اپنی ہی زندگی میں
 پہنچ دیے تھے۔ اُس وقت حضرت امیر کی عمر تیس برس سے بھی کچھ کم تھی اور شاعری
 میں ترقی کرنے کے لیے اُن کے آگے ایک وسیع میدان محدود تھا سوہ اگرچہ ادا و اصناف
 سخن میں جیسا کہ ثنویؒ نہ پہنچیں لکھتے ہیں اپنے تئیں شیخ سے بہتر سمجھتے تھے مگر شیخ
 کی غزل کو وہ بھی مانتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ۵

خسرو سر مست اندر ماہر معنی بخت شیراز محمد از مستی کو در شیراز بود

۵۔ پیر کے اشاریہ ہیں :-
 کس نہ بیند شوے غلیم دگیم
 چوں منساہ دل حلقے یاد
 تا بجایے کہ حسد یاد سیاں
 زان کئے سعدی و ثنائیں ہمسام
 یک اگر شوے و گزرا ہی دست
 کہ نہ گند و بہ دے منزل گیسر
 گرچہ شد زادہ ہنسماں داں کو نزل
 اندرین عہد دو تن گشت عیساں
 ہر دورا در غنزل آئین ہمسام
 شیر شاں ہست بدان مگر نہ ہست

نیرمیں طرح شیخ نے بچپن کے زمانے کی غزلوں کا نام غزلیات قدیم اور جوانی اور کولت کی غزلیات کا نام طلیبات اور بدائع اور آخر عمر کی غزلیات کا نام خواتیم رکھا ہے۔ اسی طرح حضرت امیر نے بھی عمر کے چار زمانوں کے موافق چار دیوان مرتب کیے ہیں۔ تحفۃ الصغر، واسطۃ الحیوة، معرۃ الکمال، بقیۃ النقیۃ، ان دیوانوں کے سوا حضرت امیر کی غزلیات سے بھی منافع پایا جاتا ہے کہ وہ صدی سے متبع سے خالی نہ تھے۔ امیر خسرو کے بعد خواجہ حافظ شیراز نے بھی غزل کی بنیاد زیادہ تراویں خیالات پر رکھی ہے جن کو سب سے اول شیخ نے چمکا دیا تھا۔ ان میں بعض مضامین خواجہ حافظ نے ایسی رونق دی ہے کہ وہ انہیں کا حصہ ہو گئے ہیں۔ جیسے قصوف۔ شرب۔ اہل ظاہر پر خرد گیری۔ دنیا کی بے ثباتی۔ عقل و تدبیر کی توہین۔ عشق و جوانی کی تو غیب وغیرہ وغیرہ +

آپ ہم کچھ غزلیں اور اشعار شیخ کے دیوان میں سے ایسے نقل کرتے ہیں جن میں مضامین مذکورہ بالا زیادہ ہانڈے کھٹے ہیں :-

برغیر تائیک شو نیم لیں دلق کنزق نام	بر باد قلاشی دہیم ایں شرک تو کھلے کھم
نئے با جواماں خود دم خاطر متا مے کند	تا کو دکاں در پے فتند ایں پیور داتنام
نہیں تنگنا مے خلوت خاطر بصحرا مے کشد	کز بوستاں بلو سحر خوش مے دہر پیغام
غافل مہاشد عاقلی در یاب گرسا جلدی	با شد کہ تو اں یا نتن دیگر چنین آلام
جائے کہ سرو بوستاں با پائے چوبین جود	مانیز در رقص آوریم آں سرو سیم اعلام
وقت طرب خوش یا فتم ایں دلبر طنا زرا	ساتی بیار ایں جام نے مطر بجا آں سازا
امشب کہ نیم عارناں اور شیخ کو بت و شن آ	آہستہ تا بنود خیر زمان شاہد باہرا

رُوئے خوش و آواز خوش دارند هر یک لذت
نگر که لذت چوں بود محبوب خوش آواز را

جان ندارد دهر که جانا نیش نیست
تنگ عیش است آن که بتا نیش نیست
گردے داری به دلدارے سپار
ضائع آن کشور که سلطانیش نیست
ماجرای عقل پر سیدم ز عشق
گفت مغزول است فرمایش نیست
در و عشق از تندرستی خوش تر است
گرچه غیر از صبر و دمانش نیست

چنان بپوے تو آشفته ام بپوے مست
که نیم خبر از هر چه در د و عالم هست
و گر بپوے کسم دیده بر نئے باشد
خلیل من همه بت های آذری شکست
علاّم بهت آنم که پای بندیکه است
بجانبه متعلق شد از هزار پرست
نگاه من به تو و دیگران به تو مشغول
معاشراں زخمی و عارفان ساقی مست
برادران و عشق نیاں نصیحت مکنید
که اختیار من از دست افت و تیرا دوست

خوش تر از دوران عشق ایام نیست
بامداد عاشقان را شام نیست
مطربان رفتند و صوفی در سماع
عشق را آغاز هست انجام نیست
از هزاران در یک گیر و سماع
زناں که هر کس محرم پیغام نیست
هر کس را نام معشوقه که هست
مے بزد معشوق مارا نام نیست
باد صبح و خاک شیر از تنغی است
هر که او در وے گرفت آرا نام نیست
تعدد یا چوں بت شکستی خود مباش
خود پرستی کمتر از اصنام نیست

دلے که عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا به صبوری هنر و فرنگ است
برادران طسیرت نصیحت مکنید
که توبه در ره عشق آگینه و سنگ است
و گر خنجره کنی بایم خراب سماع
کینیک نامی در دین عاشقان تلک است

چہ تربیت ششوم یا چہ مصلحت سینم
 بخشم رفتہ مارا کہے بود پیغام
 بیا و بگا کہے دامن نیم صباح
 بخش چنان کہ تودانی کہ بے مشاہدہ است
 ملاست از دل سعدی فردغ و غم عشق

دوش بے زوے تو آتش لبم بری شد
 تا با فوس بیا یاں نرد و غم عزیز
 چشم مجنوں چو جھنڈے ہمہ لیلی دیرے
 یاد بآں صبح کجاست کہ شہاے گر
 سعدی عقد خریا کر اشتیاق
 تنقلب در وین جامہ ناز
 جسد کروم کہ دل ہر کس نہ دہم
 محنت و قضا ہے زنداں است

او تو با مصلحت خویش کچھ پروازم
 گر تو خواہی کہ بچوئی دلم امروز کیوے
 سن خواباتی و دیوانہ ام و عافیت دس
 ماجرا ہے دل دیوانہ بختم طہیب
 گفت زبیر فحکایت کہ نوای سعدی
 بزینہ خاطر س تکلف رہا کہیم

مرا کہ چشم باقی و گوش بر چنگ است
 بیا کہ ماسپر انداختیم گزنگ است
 گرفتہ ایم و چہ حاصل کہ باد در چنگ است
 فراخ ناسے جہاں پر وجود مانگ است
 سیاہی از پیش چوں ہو کہ خود رنگ است

ایم از دیدہ ہی رفت و زین تر شد
 ہمہ شب ذکر تو می دفت و ذکر می شد
 مدعی بود گزین خواب میسری شد
 نفیسے ز دوا فاق تو می شد
 در نہ ہر شب زکریاں بھر بر می شد
 چہ حسہ دار داز مشالہاں
 چوں تو اں کرد باد و دیدہ باز
 غافل از صوفیان شاہد باز

بچو پروا نہ کہے سوزم و دور پروازم
 در نہ بسیار بچوئی و نیسانی بازم
 بیشتر دین چہ حکایت بکند غم بازم
 کہ ہمہ شب در چشم ست بفکرت بازم
 در عشق ست و نہ انک کہ چہ دریاں سازم
 تو کان معرفت بدو چہ بہا کہیم

گرد گیر آں نگارِ قہا پوشش بگنزد
 ساقیائے وہ کہ ماوردی کش میخانہ ایم
 خوشنق سوزیم و جان بر سر نہادہ شمع و
 اہل دانش را دریں گفتار با ما کار نیست
 خلق مے گویند جاہ و فضل در فرزانگی است
 عیب نیست از چشم گوہر ہیں نداری و زما
 دو چشم مست نیگویش ببرد آرام ہشیاراں
 نصیحت گوے راز من بگو اے خواجہ دم در کش
 چہ نبوے ست آنکہ عقل از من ببرد و صبر و ہشیاری
 تو با میں مردم کو یہ نظم در چاہ کنعانی
 بے کہ ز دیدہ غایبی در دل مانشتہ
 خاطر عمام بردہ خون خواص خوردہ
 مے برزند ز مشرق شمع فلک زبانہ
 عتلم بدزد و لختے چند اختیار دانش
 صوفی چگونہ گرد و گرد شراب صافی
 آں کو زہر کس نم نہ کاہ حیات دارد
 گرے بجاں و ہندت بستان کہ پیش و اما
 ہر در بادے بزد از بوستان گلے
 نوے ست ما و پیکر و نوے ست شکوے
 ما نیز جامہ مے تصوف بجا کنیم
 با خرابات آشناؤ از خرد بیگانہ ایم
 ہر گجا در مجلس شمعے ست ما پروانہ ایم
 عاتلاں را کے زبان ارد کہ ما دیوانہ ایم
 گوہر باش اینہا کہ ما زندان نافرمانہ ایم
 ہر یک اندر بحسب معنی گوہر یک دانہ ایم
 دو خواب آلودہ بر بودند عقل از دست بیداراں
 کہ سیل از سرگزشت آں کہ می ترسانی از باراں
 ندانم باغ فردوس ست و یا بازار عطاراں
 بمصر آتاں پدید آئند یوسف را خریداراں
 حسن تو جلوه می کند دیں ہمہ پردہ بستہ
 با ہمہ صیبر کردہ خود رکند حبستہ
 اے ساقے صبو حی در وہ مے شبانہ
 ہوشم ببرد زمانے تا کے عنسم زمانہ
 کج شک را نہ گنج عفت و راشیا
 ہم طعم نار دارد ہم رنگ نامدانہ
 ز آب حیات خوش تر خاک شراب خانہ
 مجروح مے کند دل مسکین بلبلے
 ہر لالہ کہ مے دمد از خاک و صبلے

بالائے خاک ہیچ عمارت نکرده اند
مکرده طلعتی ست جهان فریبناک
دی بوستان دختورم و معز و لاله زار
وامر و زغار با بے مغیلاں کشیده تیغ
دنیا پلے است رگه زار و اراخت

اے کہ آگاہ نہ عالم دردیشاں را
گنج آزادگی و گنج قناعت ملک است
طلب منصب فانی نکتہ صاحب عقل
جمع کردند و نہادند و به حسرت رفتند
در ازل بود کہ پیمان محبت بستند
عاشقے سوخته بے سرو ساقاں دیدم
نفسے سرور آورد و ضعیف از سر زد
پند و لبید تو در گوش من آید مہیات
سعد یا عمر عزیزست به غفلت گذار

لا ابالی چه کند و فست و انانی را
ویدہ را قائم و آنست کہ دلبر بینی
ہمہ دانند کہ من سبز و خط و دم دوست
سعد یا نوبتے مشب و بل صبح بکوفت
شبے دشمنے و گویندہ خوب زیبا بے

تو چہ دانی کہ چہ سودا و سرت ایشان را
کہ بہ شمشیر میسترد شود سلطان را
عقل آنست کہ اندیشہ کند پایاں را
وین چہ دارد کہ بحسرت نگذارد آن را
نشدند مرد گرش سربو و چپاں را
گفتم اے یار مکن در سیر فکرت جاں را
گفت بگذار من بے سرو بے سلاں را
من کہ بر در و حریم چه کنم در ملل را
وقت فرصت نشود و فوت گزادں را

طاقت و عظمت باشد سیر سوداں را
در نہ بیند چہ بود قائمہ بینائی را
نہ چو دیگر جواں سبز و صحرائی را
با گر صبح نہاشد شب تنہائی را
نذارم از ہمہ عالم جز این تنہائی

فرشتہ رشک بزد بر جمال مجلس من
گرافقات کنچوں تو مجلس آرائے
ضرورت است بلا دیدن و جفا برون
زدست آں که نذار دیکشن جہنائے
قیامت است کہ در روز نگار بار بخت
بر راستی کہ بلا نیست آن بالائے
و گر چه بسیخی اگر زوا و بگردانی
کہ نیست خوشتر از دور جہاں تاشائے
و گر کنی نظر از دور کن کہ نزدیک است
کہ سر سبازی اگر پیشتر نی پائے
عالم کہ عارضان را گوید نظر بدوزند
گر یا بر ما بر میند صاحب نظر باشد
زیرا کہ بادشاہ ہے چون بقوہ بگید
بنیاد حکم اول زیر دیر بر باشد
دیوانہ را کہ کوئی ہشیار باش مائل
ترسم کہ از طبیعت دیوانہ تر باشد
ساقی بیار جانے مطرب بلوے چیرے
لب بردہاں کے نہ تانیش کہ باشد

یہ ہے زلفت تو با باد عیش با دارم
اگر چه عیب گفتہ ام کہ باد پیائے است
ترا ملائمت سعدی حلال کے باشد
کہ بر گفتاری وادو در میان درایے است
الغرض شیخ سے پہلے تغزل کا میلان زیادہ تر عشق مجازی کی طرف تھا اور عشق
مجازی کے متعلق بھی صرف وہ بیدنی اور ظاہری حالتیں بیان کی جاتی تھیں جو عمام
عشق بازوں کی زبان پر جاری ہوتی ہیں۔ شیخ نے اپنی غزل میں ایسی باتیں کہیں کہیں
بلکہ اکثر وہ عشق و محبت کے بڑے عقیدہ اسرار و غوامض اور عمیق کیفیات و دراندازی کی حالات
بیان کرتا ہے جو ولایت کی زمانے میں ہر انسان پر گزرتے ہیں۔ لیکن ہر شخص ان کہیاں
نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ مجھ پر کیا گزر رہا ہے۔ مثلاً یہ بات عشق بازوں
اور پورا اوصول کے زباں زو ہوتی ہے کہ معشوق کی عیدائی ایسی سخت چیز ہے جو کسی طرح
اور کسی حالت میں برداشت نہیں کی جاسکتی لیکن یہ بات عام نظروں سے مخفی ہوتی ہے

کہ وصل کی اُمید پر جدائی بسر کرنی ایسی مشکل نہیں ہے جیسی خیال کی جاتی ہے جیسا کہ شیخ کہتا ہے:-

اے کہ گفتی بیچ مشکل جوں فراق یار سیت گر اُمید وصل باشد آن چنان دشوار سیت
یا مثلاً جو لوگ کسی کے عشق میں مبتلا ہیں اور باوجود کمال اشتیاق کے وصل سے
بہرہ مند نہیں ہوتے وہ عموماً عشق و محبت کی قید سے آزاد ہونے کی آرزو میں کیا کرتے ہیں
اور اس موقع کو یاد کر کے چپاتے ہیں۔ جب کہ دل بستگی کے سامان انہوں نے خود تھپتھپا کیے تھے
اور بار بار صورت دیکھنے یا باتیں سننے یا رابطہ بڑھانے سے ایک مردہ چٹکاری کو زیادہ فروخت
کیا تھا۔ لیکن ان کو یہ شعور بہت کم ہوتا ہے کہ اس جہن اور سوزش میں کس قدر لذت
چھپی ہوئی ہے۔ اور یہ کہ اگر با فرض ترک عشق و محبت پر آپ کو اختیار دیدیا جائے تو وہ
ہر گز اس دلدنہ قید سے چھوٹنا اگلا نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ شیخ نے کہا ہے:-

ہر عند لیسا عاشق گر لہکن نفس را از ذوق اندر و نش پر دایہ در باشد
یا مثلاً عاشق کا عام خیال یہ ہے کہ معشوق کے دیکھنے سے کبھی جی سیٹھ نہیں ہوتا اور یہ
نک وہ سامنے رہتا ہے عاشق اُس کے دیکھنے سے باز نہیں رہ سکتا مگر یہ بات بہت
خیال میں گذرتی ہے کہ عاشق کو ہوا اوقات ایسے مواقع بھی پیش آتے ہیں کہ باوجود کمال اشتیاق
کے معشوق کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے، جیسا کہ شیخ کہتا ہے:-

دل و جانم تو مشغول و نگہ پر چپ و رست تا ندانند رقیس ہاں کہ تو منظور رستی
یا مثلاً عاشق کا عام خیال یہ ہے کہ دوست سے مدت کے بعد جب ملاقات ہوئی
ہے۔ تو وہ شکوہ اور شکایت اور جدائی کی مصیبتیں بیان کرنے کا موقع ہوتا ہے مگر اس
واقعی کیفیت سے بے خبر ہونے میں کہ جب دوست سے ملاقات ہوتی ہے تو اس کے ملنے

کی خوشی میں اکثر تمام شکوے اور مچدائی کے صدمے یک قلم فراموش ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ شیخ نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے :-

گفتہ بودم چو بیائی عن سہم دل با تو گویم چہ گویم کہ غم از دل پرود چہ تو بیائی غرض کہ ایسے گہرے خیالات سے قدما کی غزل بالکل معتراتی۔ اول شیخ ہی نے

ان مضامین کی بنیاد ڈالی ہے۔ تصوف و درویشی وغیرہ کے مضامین نے غزل میں دیکھی زیادہ لذت اور نمک اور ذوق و بھر دیا۔ جن اصول پر شیخ نے غزل کی بنیاد رکھی تھی اُس کے

بعد متقرنین نے وہی اصول اختیار کیے۔ کیونکہ اُن کے بغیر غزل کا سرسبز مونا نہایت و شوار تھا اور اس طرح رقصہ رفتہ تمام ایران اور ترکستان اور ہندوستان میں ایک لگی

لگ گئی۔ ہر روزوں طبع نے غزل کہنی اختیار کی اور غزل گوئیوں کی تعداد حساب اور شمار سے زیادہ بڑھ گئی۔ ازاں جملہ بعض اکابر کی غزل نے شیخ سے بھی زیادہ شہرت اور رواج

پایا۔ علی الخصوص خواجہ حافظ شیرازی کی غزل نے اپنا وہ سکہ جلایا کہ مذکورہ بالا ملکوں میں جو لوگ شعر کا مذاق رکھتے تھے یا فقر و درویشی کی چاشنی سے باخبر تھے یا دراک، گنی سے

اشنا تھے یا خراب و کباب کا چسکا رکھتے تھے یا عشق مزاج اور عیش دوست تھے۔ سب جان و دل سے اُس پر قربان ہو گئے۔ رقص و سرود کی محفلوں میں، مالِ قال

کی مجلسوں میں، اموہ خانوں اور شراب خانوں میں، اشعار کی محبتوں میں، مشائخ کے قلعوں میں، درو دیوار سے لسان الغیب ہی کی آواز آنے لگی +

اس میں کچھ شک نہیں کہ شیخ کی غزل نے فارسی شاعری میں ایک خاص قسم کی سمت پیدا کی جس کے سبب سے قدیم جذبات کا ایک طویل الذیل باب یعنی عشق و محبت وغیرہ کے مضامین نہایت اُبّ رنگ کے ساتھ بیان کیے گئے۔ مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس

بادۂ ہوش رُبا مینی غزل سے سوسائٹی کے اخلاق، خیالات اور معاشرت پر کچھ اچھے غزل
 مترتب نہ ہوئے شعر کو خواہ وہ عاشقانہ ہو اور خواہ اخلاقی ایک پوشیدہ تعلق اخلاق کے
 ساتھ ہوتا ہے اور جو اشعار کسی قوم میں زیادہ شائع ہو جاتے ہیں اور مجالس و محافل میں
 ہمیشہ پڑھے اور گائے جاتے ہیں وہ اندر ہی اندر تمام جماعت پر اپنا اثر اس طرح
 کرتے ہیں کہ جماعت کو اصلاً شعور نہیں ہوتا اور جس قدر شعر میں نیک اور حسن زیادہ
 ہوتا ہے اُسی قدر اُس کی تاثیر جلد اور بائدار ہوتی ہے۔ شیخ سعدی، خواجہ حافظ،
 امیر خسرو، امیر حسن سنجر، مولانا جامی، وغیرہم کی غزلیں جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ ملک
 اسلامیہ کے ایک بڑے حصے میں عموماً پڑھی اور گائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان بزرگواروں
 کا کلام زیادہ تر حقائق اور معارف اور سلوک اور تصوف پر مبنی ہے لیکن اُس میں
 مجاز و حقیقت کے دونوں پہلو موجود ہیں۔ جس طرح اُس سے ایک صوفی خدا پرست
 روحانی کیفیت اُٹھاتا ہے اُسی طرح ایک بوالہوس صورت پرست کے نفسانی
 جذبات اُس کے سینے اور پڑھنے سے برائیگنمتہ ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ خواجہ
 حافظ کی غزل مجالس و محافل میں گائی جاتی ہے اور اُس کے مضامین سے اکثر
 لوگ واقف ہیں۔ وہ ہمیشہ سامعین کو چند باتوں کی ترغیب دیتی ہے عشق حقیقی
 کے ساتھ ہی عشق مجازی اور صورت پرستی و کام جوں کی بھی وہ دین و دنیا کی نعمتوں
 اور فضیلتوں سے افضل بتاتی ہے۔ مالی دولت۔ علم و ہنر۔ ناز و روزہ۔ حج و زکوٰۃ۔
 زہد و تقویٰ۔ غرض کہ کسی شے کو نظر بازی و شاہد پرستی کے برابر نہیں ٹھہراتی۔ وہ عقل و
 تدبیر۔ مال اندیشی۔ تکبر و وقار۔ ننگ و ناموس۔ ماہ و منصب وغیرہ کی ہمیشہ برتر
 کرتی ہے۔ اور آوارگی و سوائی۔ بدنامی۔ بدستی۔ بے سرو سامانی وغیرہ کو جو کہ عشق کی

بدولت حاصل ہوتا م حالاتوں سے بہتر نظر ہر کرتی ہے۔ دولت دنیا پر لات مارنا، عقل و تدبیر سے بھی کام نہ لینا، توکل اور قناعت کے نقشے میں اپنی ہستی کو مٹانا اور جو بہرہ نسبت کو خاک میں ملا دینا، مویا و مایہما کے زوال و فنا کا ہر وقت تصور باندھے رکھنا، علم و حکمت کو لغو و پوچ اور حجاب کبر جانتا، حقائق اشیاء میں کبھی غور و فکر نہ کرنا، کفایت شکاری اور انتظام کا ہمیشہ دشمن رہنا، جو کچھ ہاتھ لگے اُس کو فوراً رایگاں کھود دینا اور اسی طرح کی اور بہت سی باتیں اُس سے مستفاد ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام مضامین ایسے ہیں جو ہمیشہ بے فکر دں اور نوجوانوں کو بالطبع مغرب ہوتے ہیں اور کلام کا سادہ اور عام فہم ہونا شاعر کی فصاحت و بلاغت اور مہرب و رقاصہ کی خوش آواز می و حسن جمال اور مزامیر کی لئے اُن کو بے اثری ہے اور اُن کی تاثیر دماغ میں گنا کو دیتی ہے اور جب باوجود ان سب باتوں کے سامعین کو یہ بھی اعتقاد ہوتا ہے کہ اس کلام کے قائل اکابر صوفیہ اور مشائخ کرام ہیں جن کی تمام عمر حقائق و معارف کے بیان کرنے میں گزری ہے۔ اور جن کا شعر شریعت کا لب لباب اور طریقت کا رہنما اور عالم لاہوت کی آواز ہے تو یہ مضامین اور بھی زیادہ دلنشین ہوتے ہیں۔ پس ممکن نہیں کہ شیخ احمد اُس کے متبعین کی غزل نے سوسائٹی کو اپنے جادو سے اچھوتا چھوڑا ہو۔ اور جب ہم مسلمانوں کے اخلاق اور معاشرت پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن کو اکثر ان اوصاف سے موصوف باتے ہیں جن کی اس مجبورہ غزلیات سے ترغیب ہوتی ہے۔ عشق بازی محض سستی اُن کے ساتھ اس قدر مخصوص ہے کہ نہ صرف وہ ملتند بلکہ اکثر فاقہ مست بھی اس کا چسکا رکھتے ہیں۔ اور نہ صرف نوجوان بلکہ عمر لوگ بھی اُس کا دم بھرتے ہیں۔ حصول خرچ و ناعاقبت اندیشی عقل و تدبیر سے کچھ کام نہ لینا۔ توکل اور قناعت کے دھوکے میں

مماش کی نکر نہ کرنی غیر قوموں کی ترقی کا ذکر نہ کرو نیا و ما فیہا کو ہیج و بونج بتانا عقل انسانی کو حقائق اشیاء کے ادراک سے عاجز جانتا اور موجودہ علمی ترقیات کو سراسر ایک مہو کا سمجھنا وغیرہ وغیرہ ہماری قوم کی عام خاصیتیں ہیں جو ہمارے ہر طبقہ اور ہر درجے کے لوگوں میں کم و بیش پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہ بات کسی مشکل ہے کہ ہم لوگوں میں یہ خاصیتیں اسی شعرو غزل کی بدولت پیدا ہوئی ہیں۔ شاید اس کے اصلی اسباب کچھ اور ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ عاشقانہ اور متصوفانہ اشعار نے اس حالت کے ترقی دینے میں بہت کچھ بد پہنچانی ہے ۛ

تسید ٹون صاحب نے جو کلمتہ ردیو مورثہ جون ۱۹۳۷ء میں خواجہ حافظ کا حال لکھا ہے اس میں ایک عجیب حکایت لکھی ہے جس کا نقل کرنا اس مقام پر شاید بے موقع نہ ہوگا۔ وہ لکھتے ہیں کہ دوسری جو کہ حافظ کا چچا ہے ایک روز وہ اور حافظ کسی جگہ بیٹھے تھے اور سعدی غزل لکھ رہا تھا جس کا پہلا مصرعہ حافظ کی بھی نظر پڑ گیا۔ اتفاقاً اسی وقت سعدی کسی کام کے لیے وہاں سے اٹھ گیا اور اپنی غزل کا کاغذ ساتھ لے گیا۔ حافظ نے اس مصرعہ پر دوسرا مصرعہ لگا کر اور پوری بیت ایک پرچے پر لکھ وہاں چھوڑی ... اور آپ چل دیا۔ شیخ نے پھر وہاں آکر حافظ کو نہ پایا مگر وہ شعر لکھا ہوا دیکھا جس میں سعدی پر کچھ جوٹ کی تھی۔ سعدی اس بات سے ناخوش ہوا اور حافظ کو بلا کر پوچھا۔ کہ یہ شعر تو نے لکھا ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ شیخ نے اس سے ساری غزل پوری کرانی اور جب وہ غزل سنی تو اس کو بد دعا دی۔ کہ جو شخص تیری غزل پڑھیں گا وہ عقل سے بیگانہ رہے گا۔ اس کے بعد صاحب موصوف لکھتے ہیں کہ متطہ ظیفہ کے اکثر شیعہ مسلمان اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ بیشک سعدی کی بد دعا حافظ کے حق میں مستجاب ہوئی کیونکہ اس کے

ہر ایک شعر میں یہ تاثیر پائی جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ ”یہ حکایت صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ خیال بالکل غلط ہے کہ حافظ کی غزل سے دیوانگی اور وحشت پیدا ہوتی ہے، میں کہتا ہوں کہ یہ خیال تو شاید غلط نہ ہو مگر یہ حکایت قطعی غلط ہے کیونکہ شیخ اور خواجہ کی وفات میں پورا ایک صدی کا اگلی بچا ہے۔ قسطنطنیہ کے شیعوں کا خیال میرے نزدیک اس اعتبار سے صحیح ہے کہ خواجہ حافظ کی غزل کی تمکرات اور مزاوت سے بیشک بارہ و احرا کے دلوں میں دنیا کی بے ثباتی اور توکل و استغنا و قناعت کا نہایت بڑا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور او باش والواط کو بے فکری۔ نا عاقبت اندیشی۔ عشق یانی۔ بدنامی۔ رسوائی کی ترغیب ہوتی ہے۔ اور قوم کی موجودہ حالت کے لحاظ سے پہلی تاثیر بھی ویسی ہی خانہ برانداز اور خائماں سوز ہے جیسی دوسری۔ ہر زمانے کا جدا جدا اقتضا ہوتا ہے۔ جب دو متحد اور ذی اقتدار لوگ دنیا طلبی اور حُب جاہ میں سرسُرمہنگ اور مستغرق ہو جاتے ہیں اور جسمانی خوشیوں میں محو ہو کر روحانی مسرتوں کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں اور عقل و شریعت کے احکام معطل ہونے کے قریب جا پہنچتے ہیں اُس وقت البتہ اُمید ہو سکتی ہے کہ ایسی ترغیبوں سے کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہو۔ لیکن ایسی حالت میں جب کہ تمام قوم کم ہمت اور پست حوصلہ ہو گئی ہو۔ اور اولوالعزمی کا تخم اُن کی طبیعت میں جل گیا ہو۔ جب کہ تمام دنیا کی قومیں ترقی کی طرف متوجہ ہوں اُس وقت دنیا سے اُن کا دل سرو کرنا اور قناعت اور توکل کا اُن کو سبق پڑھانا بالکل ایسا جی بے جیسے ٹٹماتے ہوئے چراغ میں بجائے تیل ڈالنے کے زور سے پھونک مار کر اُس کو گل کر دینا۔ پس ممکن ہے کہ شیخ اور اُس کے متبعین کی غزل نے اُس زمانے میں جب کہ مسلمانوں کے دماغ میں نشہ جاہ و نبوی مہیج پرتھا کچھ مفید نتائج پیدا کیے ہیں۔ لیکن اس زمانے میں میرے نزدیک اس سے مزید

کا اندیشہ ہے ۛ

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ شیخ اور حافظ کی غزل پر کچھ اعتراض کرنا مقصود ہے بلکہ اس سے اُن کی کمال سحر بانی اور سبقت زبانی ثابت ہوتی ہے۔ شاعر کا کمال یہی ہے کہ جو کچھ وہ کہے اُس سے لوگ متاثر ہوں۔ نہ یہ کہ اُس سے کبھی مضر متلاش پیدا نہ ہونے پائیں۔ ہاروت نے ہاوچہ وکیہ بنی آدم کی ہزاروں جانبیں تلفت کی ہیں اور شراب نے بے شمار آدمیوں کو اخلاقی اور جسمانی مضرتیں پہنچائی ہیں با ایں ہمہ اُن کے موجدوں کی دانشمندی کا تمام دنیا اعتراف کرتی ہے اور کرے گی ۛ

قصائد وغیرہ

اس مجموعے میں شیخ کے مدحیہ قصیدے، مرثیے، ترجیع بند، مکتع اور ثلث جمع کیے گئے ہیں۔ یہ مجموعہ غزلیات کی نسبت بہت تھوڑا ہے۔ شیخ نے قصیدے میں کچھ زیادہ نام اور شہرت حاصل نہیں کی۔ یا تو اُس کی طبیعت ہی قصیدہ گوئی اور مدح سرائی کی گوں نہ تھی یا وہ یا اُس نے صبح و شام کے طریقہ مزاج کو مکروہ سمجھ کر اختیار نہیں کیا۔ مگر چونکہ اُس زمانے کے موافق ایک ایسے نامور شاعر کو جیسا کہ شیخ تھا کچھ کچھ قصیدے کے نام سے لکھنا ضرور تھا۔ اُن اُس نے کسی قدر قصائد لکھے ہیں جو کہ پہلے قصیدہ گوئیوں کی طرز سے بالکل مغائر ہیں ۛ

شیخ سے پہلے جو حالت قصیدہ گوئی اور مداحی کی مسلمانوں میں تھی اُس کی تفصیل کرنے کا یہاں محل نہیں۔ مگر مختصر یہ ہے کہ منصور بن ہمدانی عباسی خلیفہ بغداد کے زمانے سے شعرا کو نہایت گراں بہا صلے اور انعام لینے لگے تھے۔ ایک ایک شعر پر لاکھ لاکھ درہم شلوں کو بل جاتے تھے خلفاء اور امرا کو اپنی تعریفیں سننے کا ایسا شوق ہو گیا تھا کہ اُن کا صلاح کسی اور

شخص کی طرح میں زیادہ سہانہ کرتا تھا تو ان کو سخت ناگوار ہوتا تھا اور اگر تشبیہ میں زیادہ شعر لکھ لانا تو شکایت کرتے تھے کہ یہ لوگ طبیعت کا سارا زور تو خال و خط کی تعمیر میں خیر کر دیتے ہیں صرف کچھ بچے کچھے خیالات ہمارے سرمارتے ہیں۔ ہزاروں علما و فضلا نے قصیدہ گوئی اور مداحی کو اپنا پیشہ ٹھہر لیا تھا۔ اور شاعری میں شہرت ہو جانے کے بعد کسی کو اس بات سے چارہ نہ تھا کہ ذی اقتدار لوگوں کی مدح سرائی میں خامہ فرسائی کرے شعرا تمام ممالک اسلامیہ میں اس امید پر سفر کرتے تھے اور قصیدہ گوئی کی بدولت اطراف و جوانب سے مال و دولت جمع کر کے لاتے تھے۔ عتاسیوں کے علاوہ فاطمی دہلی۔ کرڈی۔ طاہری۔ صفاری۔ سامانی۔ غزنوی۔ سلجوقی۔ خوارزم شاہی۔ وغیرہ تمام ممالک میں مداحوں کی نہایت قدر کی جاتی تھی۔ ایران میں بھی سامانیوں کے عہد سے پہلے تو عربی قصائد کا ہی زور شور رہا۔ مگر سامانیوں کے زمانے میں ایران کی شاعری کا مدار زیادہ تر فارسی زبان پر اکٹھیرا۔ فارسی قصیدے نے خوب رواج پایا۔ تلمیذ۔ رشید قافانی اور آفریزی وغیرہم نے فارسی قصیدے میں وہی شہرت حاصل کی جو عربی میں متبعین۔ ابو تمام۔ بختری اور ذوالرئسہ نے حاصل کی تھی +

اس بیان سے ظاہر ہے کہ شیخ سعدی جیسے مشہور شاعر کو سلاطین و امراء کے عہد کی تعریف میں قصیدہ لکھنا ایسا ہی ضروری تھا جیسے درباریوں کو جشن اور حوازیں نذر کھانا مگر قصیدے کی حالت اس وقت ایسی ہوئی تھی کہ شیخ کو اپنی جیلتی، ہشتاقت و درخندگی کے سبب اس روش پر چلنا دشوار تھا۔ مدوح کی ستایش میں سرسر عقل و عادت کے خلاف مبالغے کیے جاتے تھے۔ الفاظ کی سادگی اور بے تکلفی قصائد میں مذموم سمجھتی تھی مسائل علمیہ اور مقدمات حللیہ اور سلوک و تصوف کے دقائق اور علوم مختلفہ کی

اصطلاحیں اظہارِ علم و فضل کے لیے اُن میں بالقصد داخل کی جاتی تھیں۔ صنائع
 لفظی خصوصاً تجنیس و ترکیب وغیرہ کو اُن کا زیور سمجھتے تھے۔ شیخ کی آزاد دی و جی گئی
 خصوصاً سادہ بیانی جو اُس کی طبیعت میں ودیعت کی گئی تھی اِن تکلفات لائینی سے
 مانع تھی اُس کے کلام سے جا بجا یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ مبالغہ اور خوشامد کو نہایت
 ناپسند کرتا تھا۔ ظہیر فاریابی نے قزل ارسلان کی مدح میں ایک جگہ یہ شعر لکھا ہے :-
 نہ کرے فلک مند اندیشہ زریہ پاک تا بسہ ہر رکاب قزل ارسلان ہر
 شیخ بوستاں میں جہاں اتابک ابوبکر سعد کی تعریف لکھتا ہے وہاں ظہیر کے
 اس شعر پر اس طرح تعریفیں کرتا ہے :-

براہِ تکلف مرو سعید یا اگر صدق داری بیاروبیا
 تو منزل شناسی و سفر راہِ زو تو حق گوے و خسر و حقائق شنو
 چہ حاجت کہ نہ کرے آسمان نہی زیرِ پائے قزل ارسلان
 مگو پائے عزت برا خفاک نہ بگو ز دے اخلاص بر خاک نہ

اس کے سوا اور اکثر جگہ اُس نے مدح بیشکلی سے نفرت اور اعراض کیا
 ہے۔ اُس کے ایک قطعہ کا یہ مضمون ہے کہ وہ لوگ مجھ سے کہتے ہیں کہ اے سعدی تو
 کیوں سختیاں اٹھاتا ہے اور کیوں اپنے کمالِ شاعری سے متنع نہیں ہوتا؛ اگرچہ کوئی
 اختیار نہ ہو تو نہال ہو جائے مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی رئیس یا امیر کے دروازہ
 پر اپنا مطلب در یوزہ گردن کی طرح لیجاؤں اگر ایک جو بھر تیر کے عوض میں کوئی مجھ کو
 ستونہ نہ بخش دے تو وہ مستحقِ شکر ہے اور میں قابلِ نفرت نہ
 شیخ کو قطع نظر اس کے کہ مبالغے اور خوشامد سے نفرت تھی کوئی ضرورت بھی ایسی

واعی نہ تھی کہ وہ آنکھیں بند کر کے اگلی بیڑوں کے پیچھے قدم بقدم چلنے پر مجبور ہو جاتا اور قصیدہ گوئی کا جو اُس وقت کہاں سمجھا جاتا تھا اُس کے ماحصل کو بے میں مقتضائے طبیعت کے خلاف کوشش کرتا۔ وہ سلطانی خدمات سے ہمیشہ متنفر رہتا تھا۔ اور اپنے دوستوں کو اُس سے باز رکھنے میں کوشش کرتا تھا۔ پس اُس کو اس بات کی کچھ پروا نہ تھی کہ قصیدے کو مقبول خاص و عام بنائے اور اس فریضے سے دربار میں تعرب حاصل کرے جتنے نامی قصیدہ گو ایران میں گزرے ہیں سب بادشاہوں کے ہاں اس خدمت پر مامور رہے ہیں کہ خوشی کی تقریروں میں طوفان کے تودے بنا کر لائیں اور اُن میں جس قدر زیادہ مبالغہ اور جھوٹ کو کام فرمائیں اسی قدر گراں بہا صلے اور انعام پائیں۔ چنانچہ ظہیرِ قزل ارسلان کے ہاں انوری سلطان سبخر کے ہاں۔ رشیدِ موطا خوارزم شاہ آتسر کے ہاں اور خاقانی شرواں شاہ کے ہاں ملک الشعراء تھے۔ ان لوگوں کی تمام طاقت اور لیاقت قصیدہ گوئی میں صرف ہوئی تھی اور اُن کی ترقی اور تقریباً مدار صرف اُن باتوں پر تھا جو اُس زمانے میں قصیدہ گوئی کے لیے ضروری تھیں۔ یہی سبب ہے کہ قصیدے کے سوا کوئی بڑی یا دگراں نحوں نے نہیں جھوڑی۔

پس اگرچہ شیخ جیسے مشہور اور نامور شاعر کو اُس زمانے کے دستور کے موافق کچھ نہ کچھ قصیدے کے نام سے لکھنا ضرور تھا۔ لیکن اُس کو ویسے مجبورے اور ناانگیز طبیعت کے ہونے کے سبب یہ کچھ ضرور نہ تھے جیسے کہ انوری یا در ظہیر وغیرہ نے باز دے دیں۔ اسی لیے غلطی سے یہ خیال کیا گیا ہے کہ شیخ کو قصیدہ لکھنا نہ آتا تھا۔ میں ہرگز اس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ اُس کو معمولی جہک دمک کے ساتھ قصیدہ لکھنے پر قدرت نہ تھی بلکہ میرے نزدیک جس طرح زور و کوشش سے مانع ہوتا ہے اسی طرح طبیعت کی استقامت بھی بے راہ

نہیں چلنے دیتی۔ اس میں شک نہیں کہ فارسی میں جس قدر قصیدہ مد شعاعی سے متجاوز ہو گیا ہے اسی اور کوئی صنف نہیں ہوئی۔ مدحیہ قصائد سے ہمیشہ یہ مقصود ہونا چاہیے کہ ممدوح کی صفات کو سنکر خاص و عام کے دل میں اُس کی محبت اور اُس کے ساتھ حسن ظن پیدا ہو۔ اور خود ممدوح پر یہ اثر ہونا چاہیے۔ اگر وہ صفات اُس میں موجود ہوں تو اُن میں اور زیادہ ترقی کرے یا کم سے کم اُن کو اُنسی حال پر قائم رکھے اور اگر نہ ہوں تو اُن کے حاصل کرنے میں کوشش کرے۔ یہ طلب جیسا کہ ظاہر ہے جب ہی حاصل ہو سکتا ہے کہ جو صفات مدح میں ذکر کی جائیں وہ ممدوح کی ذات میں یا تو فی الواقع موجود ہوں یا اُن کے موجود ہونے کا احتمال ہو۔ ورنہ ممدوح کے دل میں اُسی مدح کی وقعت ایک ہجو بیخ سے زیادہ نہ ہوگی۔ مثلاً ظہیر فریابی نے جو قزل رسلاں کی مدح میں یہ لکھا ہے کہ تصویر جب ساتوں آسمانوں اور عرش و کرسی کو طے کر لیتا ہے تب جا کر قزل رسلاں کی رکاب پر بوسہ دیتا ہے۔ اس سے قزل رسلاں کے دل پر سوا اس کے کہ اُس کو ہجو بیخ سمجھتا ہو اور کیا اثر ہوا ہوگا۔ یا مثلاً انوری جو مجد الدین ابوالحسن کی شان میں لکھتا ہے کہ اگر وہ زمانہ گزشتہ کو رحبت کا حکم دے تو یہ بھر کر زمانہ آئندہ کی جگہ آجائے۔ اس سے ابوالحسن کے دل میں سوا اس کے کہ مداح مجھ کو بناتا ہے یا میرا خاک اڑا جاتا ہے اور کیا خیال گزرا ہوگا۔ یہی حال ان تمام قصید گوینوں کی مدح کا ہے جن کو ایران اور ہندوستان وغیرہ میں سب نے تسلیم کیا ہے۔ شیخ نے نہ عدم قدرت کے سبب بلکہ فطر کرہت کے سبب مدح و ستائش کے اس ناپسندیدہ طریقے کو اختیار نہیں کیا۔ اُس نے قصائد بھی اُسی اپنی شیریں زبانی اور سادہ بیانی بے تکلفی کے ساتھ جو کہ اُس کے کلام کی عام خاصیت ہے لکھے ہیں اس کے قصائد

سے کمال آزادی اور حق گوئی ثابت ہوتی ہے اس نے اکثر قصیدے اور ترجیع وغیرہ
محض محبت اور خلوص اور دلی جوش سے لکھے ہیں نہ خوشامد کی راہ سے اور نہ صلے و
انعام کی امید پر۔ باقی جس قدر قصیدے بضرورت سلاطین عمدا و حکام وقت کی
شان میں لکھے ہیں۔ ان کے اسلوب بیان سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے اہل دنیا
کی تنبیہ اور نصیحت و پند کے لیے قصیدے کو ان سے خطاب کرنے کا ایک ذریعہ قرار
دیا تھا۔ کیونکہ وہ بالکل مواظف و نصاب سے بھرے ہوئے ہیں۔ بعض قصیدوں میں
پند و اندیش کے سوا محبتہ اشعار و دوچارے زیادہ نہیں۔ یہ وہ قصیدے ہیں جو اس
نے اپنے دوست اور معتقد امیروں اور بادشاہوں کے ساتھ نازل کیے ہیں۔ ان کے
سوا اور قصیدوں میں اول صحت و ستائش کی چاٹ پھر نصیحت کرنی شروع کی ہے +

شیخ کی قصیدہ گوئی کا ڈھنگ اور اس کی علت غائی جو اس نے قرار دی تھی
اشعار سے معلوم ہو سکتی ہے +

انابک ابو بکر بن سعد زنگی جو فارس کا بادشاہ تھا اور شیخ اس کی رعایا میں سے
تھا اس کی طرف خطاب کر کے کہتا ہے :-

بنویت اند ملوک اندریں پہنچ سرے	کنوں کہ نہوت بست اے ملک بعدل گرے
چہ مایہ پر سبیں ملک سہ وراں بودند	چو دور عسر بسر شد درآمد از پاسے
نیانہ بایر و طاعت نہ شوکت و ناموس	بلند ہانگ چہ سود و میاں تھی چو در اسے
جو تیغ و نیزہ گرفتند جنگ جو یاں ملک	تو برد بحر گرفتی بعدل و بہت وراے
چو جہت است چہ حاجت بہ گزشتہ کوب	چو دولت ست چہ حاجت بہ تیر خوشن غاسے
عمل یار کر رفت سرے آخرت بہت	نہ عود سوز بکار تیر ست نہ عینر اسے

ہر آن کست کہ بہ آزار حلق فرماید
 بکام دل دشمن نشیند آن مغرور
 دیار مشرق و مغرب بگیرد جنگ جوئے
 نگویمت چو زبان آوران رنگ آمیز
 نکاہد آبخہ نوشتہ است مسر و نقرایہ
 دوسرے قصیدے ہیں چند مہتمہ شعر لکھ کر اتابک ابو بکر کی طرف اس طرح خطاب کرتا ہے :-

پنج شیوہ درویش نیست تا گویم
 نگویمت کہ بفضل از کرام تنزاری
 و گرچہ این ہمہ ہستی نصیحت اولیٰ تر
 بسی خوشش کہ ناگزیر اغت شہود
 خداے یوسف صدیقی را غریزہ کرد
 شکوہ لشکر و جاہ و جلال و مالکست
 بقابے ملک اندر وجود یک دست
 پس از گرفتن عالم کو کج خواہد
 بہ نیک و بد چو براید گذشت آن بہتر
 ہزار سال نگویم بقاے عمر تو باد
 ہمیں سعادت و توفیق بر مزیت باد
 تسک سلجوق شاہ بن سلق شاہ جو اتابکوں کے خاندان میں بڑا ظالم بادشاہ گذرایا

اور جو آخر کو اپنے ظلم کے سبب قتل کیا گیا اُس کی مع میں چند شعر لکھ کر کہتا ہے :-
 مراد سعدی از انشا دو ز حمت خدمت نصیحت است بسبح قبول شاہنشاہ
 دوام دولت و آرام ملکوت خواہی ثبات راحت و امن فرید وقت و جاہ
 مکر بطاعت و انصاف عدل و عفو پسند چو دست رحمت حق بر سرست نہادہ کلاہ
 توروشن آئینہ زارہ در دمسند بعرس عزیز من ! کہ اثر مے کند در آئینہ آہ
 مسلمان بدآموز را سخن مشغول کرد بر سال بمانی بکام نیکی خواہ
 ایل خاں یعنی ہولاکو خاں یا اُس کے بیٹے آبا قبا خاں کی شان میں جن کی ہمیت
 روم و روس و چین کے بادشاہ لڑتے تھے مدحیہ اشعار لکھ کر لکھتا ہے :-

ہر نوبتے نظر یکے مے کند سپہر ہر تہ تے میں یہ یکے می دہد لہاں
 بجے نشان کہ دولت باقیست بر وہ کایں عمر گاہ باغ بہارست و گل خراب
 لے باوشاہِ رُوحے زیرِ موزانِ نشست اندیشہٴ تقلب دوراں کن دُعاں
 چوں کلام جادواں متصور بنی شود حُرّم کسے کہ زندہ گست نہ جادواں
 ناداں کہ کجکل می کند دگنج مے بند فروور دشمن ست تو بردوستان نشان
 یارب تو ہر چہ رے صوابست و فعل خیر اندر دل سے فلک بن بردست بے براں
 آہوے طبع بندہ چنیں مشک میدہم کہ پارس سے بر نہ بیتا تارش راں خاں

تسوارانیکانوجو خاندانِ آماک کے زوال کے بعد سلطانِ آبا قبا خاں سپہر ملوک خاں کے
 حکم سے فارس کا فرماں روا مقرر ہوا تھا اور اپنے قدیم تلماری مذہب پر نہایت پختگی سے ثابت قدم
 تھا۔ اُس کی شان میں جتنے قصیدے شیخ نے لکھے ہیں اُن میں منقذہ اشعار کے سوا باقی تمام
 نصیحت پر بندہ راج ہے۔ ازل و قبلہ ایک قصیدے میں بہت سے مواظف و نصائح کے بعد لکھتا ہے :-

حراش باد ملک و باد شاہی کہ پیشش بوج گویند از قناد
 عروس زشت زیبا کے تو ال کرد و گر بر خود کند و یا کے متلا
 اگر مروت ہمیں بالا و ریش اند بہ نیزہ نیز بہتہ است پر ہم
 چنیں پسند از بد زشتیہ ہاشی آلا گر ہو شکاری بنو از ہم
 جو یزدانت حکم کرد و مخصوص چناں رمی در میان خلق عالم
 کہ گرد قتی مکان بادشاہیت نہا شد بہ چمن ال باغی گرم
 نہ بر کس حق تواند گفت گستاخ سخن تلکے ست سعدی در اسلم
 مقامات از دوبرہن نیست فردا بہشت جہادانی یا بہتہ
 سلوک شاہ جس کا ذکر او ہو چکا ہے اس کی طرح کو ایک اور قصیدے

اس طرح ختم کیا ہے :-

جہاں مساند و آثارِ مملکت ماند بخیر کوش و صلاح و بعدل کوش گرم
 کہ ملک و دولت بتھاں لگینہ آرا مساند و تابہ قیامت برو ہمازم
 خطاے بندہ نگیری کہ ہر آن ملک شہید و اندھیمت ز کثر انجند
 خنک کے کہ پس از دوسے حدیث نہ کنند کہ جز حدیث نے ماند از بنی آدم
 ان کے سوا جو قصیدے خواجہ شمس الدین جرنی صاحب دیوان اور
 بہائی خواجہ علاء الدین جرنی اور محمد الدین رومی اور فتح الدین ابوالکبر
 وغیرہم کی مدح میں لکھے ہیں ان میں بھی مدح اکثر اسی نام ہے زیادہ تر نصیحت و نید ہے
 اور بہت سے قصیدے ایسے بھی ہیں جو کسی کی مدح میں نہیں ہیں ان میں صرف تعریف
 و مواعظ یا فصل بہلہ کا سماں یا مستحق کی تعریف یا حمد الہی وغیرہ مذکور ہے +

ایک مختصر قصیدہ اول سے آخر تک بھی اس مقام پر نقل کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین کو
 آسانی اور بصحت دونوں کا ڈھنگ معلوم ہو +

مح و موعظہ محمد الدین اومی

جہاں برآب نہادہ است زندگی با غلامِ جنتِ آتم کہ دل برو نہ نہاد
 جہاں نہ اندوختہ ام و آن آدئے کہ باز ماند و زود در جہاں بر بنکی یاد
 مراے دولت باقی نفیم آخرت است زمینِ سعادت نگہ کن چوئے نہی بنیاد
 کدزم عیش دریں بوستان کہ باو چلے ہے برآورد از بیخ قامت شمشاد
 یہاں عاریتی خانہ است در رویل چراغِ عمر نہادہ است بر در بچہ باد
 بسے برآید و بے مافروشد و خورشید بہار گاہ خزاں باشد دگمے مراد
 برآں چہ می گذرد و دل منہ کہ دہلہ بسے پس از خلیفہ بخوار گدشت در بناد
 گرت ز دوست برآید چو نخلِ باش کریم ورت بدست نہا شد چو سر و باش آزاد
 بسے بیدہ حسرت زہیں نگاہ کند کسے کہ برگ قیامت ز پیش نظر ستاد
 و جو حستانِ بدل می کنند و زہیں ہماں ولایت کیخسرو است و ملک قباد
 چو طغیان بر عہدہ بازید و برہم خندید عجب تر آنکہ نہ گشتند دیگران استاد
 عروسِ ملک نکو دے و خیر بیت وے و فنا نمی کنند این سست مہر و الماد
 نہ خود سر پر سیلِ ہاں بباد رفتے و پس کہ بر کعب کہ سر پر بیت می رود و بباد
 ہمیں نصیحت من گوش دار و یکی کن کہ دائم از پس مرگ نمی بنیسی یاد
 خداست چہ ختم بصیرت کہ گرد کرد و خورد بیزدگوسے سعادت کہ مرگ کرد و بداد

چناں کہ صاحبِ فرخندہ راے مجذوبین
 کہ پنجِ اجرتِ اندوہنا ہے خیر نہاد
 نگویمت بہ تکلفِ فلانِ دولتِ دین
 بیٹھ مجھ و معانیِ جہانِ دانش و ادب
 تو اں برادرِ صاحبِ ولی کہ ماؤں ہر
 بسالما چو تو فرزندِ نیکِ محبتِ ترا
 ہر روز گارِ تو ایامِ دستِ فتنہ بہت
 برین تو درِ اقبالِ ہر جہاں کُشاؤ
 بس ست خلقِ جہاں را از تو نیکِ قضاؤ
 کیے دعا گزشت بے رعوت از سرِ صدق
 خدات در نفسِ احسینِ بیاؤ راؤ
 تو ہم زیاں نہ کنی کہ بصدقِ دل گوئی
 کہ آفرینِ خدا بر روانِ سعدی باد
 ایک ترجیعِ بند کے کچھ اشعار بھی جو کہ شیخ نے سعد بن ابوبکر کے مرنے میں لکھے ہیں اور
 طیات میں غلطی سے امیر فخر الدین ابوبکر کے نام پر لکھ دیا گیا ہے بطور نمونے کے
 یہاں نقل کیے جاتے ہیں *

غریباں را دل از ہر تو خون بست
 دلِ خویشاں نے دائم کہ چون سعد
 عنانے گرچہ چوں شاید گرفتن
 کہ از دستِ شکیبائیِ ردن بست
 مگر شاہنشاہِ اندرِ قلبِ شکر
 نے آید کہ رایتِ سرِ نگوں بست
 شکیبائیِ مجوازِ جہانِ مہجور
 کہ بار از طاقِ مسکینِ فردن بست

۱۵۱ امیر فخر الدین ابوبکر آٹا بک ابوبکر کے ارادے نامہ اس سے تھا جو اپنی درجے سے منصفی بات بیکر شہزادہ کو
 تک پہنچا تھا اور سعد ابوبکر آٹا بک کا بیٹا تھا جس نے اپنے ہا کو نکالنے میں ہذا کو فتح کیا تھا ابوبکر نے اپنے بیٹے سعد
 ابوبکر کو اظہارِ دوستی، خیر خواہی کے لیے بغداد میں بھیجا تھا جب وہاں سے باعز از تمامِ جنت ہوا تو راہ میں باپ
 کے مرنے کی خبر سنی جس سے اور وہی عہدِ دل کی شجہ اس کو خوش ہونا چاہیے تھا، اس کو اس جہز سے اب سعد
 ہوا کہ راہ میں ہی سہت بیمار ہو گیا اور رستے ہی میں باپ کی وفات سے بازو روزِ صبح گیارہ بجے اس کی سن ۴۱ سال
 شیریں آئی خوشی نے یہ رشتہ لکھا ہے۔ جیسا ترجیع کے شعر سے ظاہر ہے۔ سعد کے بعد اس کا بیٹا آٹا بک بیکر شہزادہ
 اس کا بھانجپن ہوا +

سکوں در آتش سوزندہ لغم
 کونیا صاحبے بر عمد و خوں خوار
 نہ اکنوں است بر ما جوراً یام
 نئے دائم حدیث نامہ چون ست
 بزرگاں چشم دل و انتظارند
 غلاماں دور دگر ہرے فشانند
 ملک خان سیاق و بر و خاں
 کشتا ہنشاہ عادل سعد بوبکر
 حرم شادی کناں بر طاقیایاں
 زمیں می گفت عیشے خوش گذاریم
 آمید تاج و تخت خسروی بود
 چه شد پاکیندرہ رویان حرم
 نشاید پاره کردن زیور و زوے
 ایسکن! چنیں داغ جگر سوز
 بلے شاید ز مجوراں بگریزند
 نئے دائم حدیث نامہ چون ست
 پس از مرگ جواناں گل مماناد
 کس اندر زندگانی قیمت دوست
 سر آمد روزگار سعد بوبکر
 نشاید کرو۔ و در ماں ہم سکون ست
 زمانہ مادرے بے مہود و دل ست
 کہ نذر دورانی آدم تا کنون ست
 ہے بیستم کہ عنوانش بخون ست
 عزیزاں وقت و ساعت می شانند
 کینزراں دست و ساعد می گزارند
 بر ہواراں تازی بر سوارند
 بہ ایوان شہنشاہی در آزند
 کہ مروارید بر تاجش ببارند
 ازاں پس آساں گفت آر گذارند
 ازین غافل کہ تابو تش در آزند
 کہ بر سر کاہ دہر زیور غبارند
 کہ مردم تحت امر کردگارند
 نئے شاید کہ فریادے نوازند
 کروا باشد کہ مظلوماں ہزارند
 ہے بیستم کہ عنوانش بخون ست
 پس از گل در چین بلبل خواناد
 نداند کس چنین قیمت مداناد
 خداوندش ہرست در رسد اناد

بہلنی رفت از دنیا ہے شیوے زلال کام و حلقش چکاناد
 جزا ہے مردہ رفتن عمر سہمی شراب از دست پیغمبرستاناد
 دریں گیتی مظفر شاہ عادل محمد نام بردارش بماناد
 سعادت پر تونیکاں دہانش بخوبی صالحا تشنچہ ورناد
 روانِ سدر را با جانِ بوبکر بر آج روح و راحت گستراناد
 بکام دوستان و بختِ فیروز بسے دورانِ دیگر بگذراناد
 نے دائم حدِ مہیش نامہ چون ست ہمے بسیم کہ عنوانش بخون است

صاحبیتہ

یہ مجموعہ شیخ کے متفرق اشعار کا مجموعہ کے قریب ہے جس میں قطعہ - رباعی - مزد -
 قطع - شذوی وغیرہ جمع کی گئی ہیں۔ چونکہ شیخ کے ساتھ خواجہ شمس الدین حسین صاحبِ ان -
 کو کمال خلوص اور عقیدت تھی اس لیے شیخ نے اس مجموعے کا نام صاحبیتہ رکھا ہے +
 ان اشعار میں کوئی نئی خصوصیت نہیں ہے جس کا ذکر کیا جائے اشعار نصیحت و
 ہند پر اور کسی قدر حسن و عشق کے مضامین پر مشتمل ہیں۔ چند قطعے اور رباعیاں جو
 سرسہ بی نظریں اچھی معلوم ہوئیں نقل کی جاتی ہیں +

قطعات

ناکساں را فراتے ست عظیم گرچہ تاریک طبع و بد خویند
 چو دو کس مشورت کنند بہم گوید این عیب من ہی گویند
 سنگے شکایت با ایام پاکے مے گفت نہ بینیم کہ چہ برگشتہ حال و مسکینم

نہ آشیانہ چو مرغیاں نہ غلہ چوں نوراں
گرم دہند خورم ورنہ مے روم آزاد
مرا نہ برگ زمستان نہ عیش تابستان
نہ در ریاضت و خلوت مقام می سازم
بہ قصہ کہ تناول کنم ز دست کسے
چو گریہ ورنہ مے با یم ز دست مردم چیز
بجای من کہ نشیند کہ در مقام صفا
حال سیرت ازین جنس و خوبی صفت است
جواب داد کزین بیش لغت خویش مگو
بہمیں دو خصلت ملوں کفایت است

نظر کردم بہ چشمِ راس و تدبیر
نگویم لب بہ بند و دیدہ برد و
زمانے بحث علم و درس و تزیل
زمانے شعر و شطرنج و حکایت
خداے است اُن کہ ذاتِ بیخاش
رحم اللہ یا معشر الماضین
راحت نفس بندگانِ خداے
اُن عنبر زغال جو دندہ می نشوند
بس دست دعا بر آسمان بتود

قناعت صفت و بردباری آمیتم
نہ ہم چو آدمیاں خشنناک نشینم
کفایت است ہمیں پوستیں پاریم
کہ جای گاہ کلون ست و سنگ و بالینم
رواست گر بزند بعد از ازاں بزد و پیغم
در اوستادہ بود ریزہ ریزہ چہ پیغم
برابر ست گلستانِ دقل سگیتم
چہ کردہ ام کہ سزاوار سنگ و نفرتم
کہ خیرہ گشت زو صفت زبان تحسینم
غریب دشمن و مردار خوار مے بینم

ندیدم بہ ز خاموشی خضالے
ولیکن ہر مقامے راقمالے
کہ باشد نفس انساں را کمالے
کہ خاطر را بود دفع ملالے
نہ گردد ہرگز از حالے بجالے
کہ بہ مردی قدم پیر دندے
راحت جہان خود قسم دندے
کاش ایں ناکاں بزد دندے
تا پاے بر آمدت بہ سنگے

اے گرل نفیست کہ روزے تا کہ ہر سداقت پینگے
 اے طفل کہ دفعِ مگس انخود تونی ہر چند کہ بالغ شدی آخستہ نہانی
 شکرانہ زور آورے روز جوانی آن ست کہ دستد بہر پیر برانی
 صانع نقش بند بے مانند کہ ہمہ نقش او نگو آید
 رزق طائر نہاد و پر و بال کہ ہمہ طعمش نہر و آید
 روزے عنکبوت را بگلشن چہرہ و حسد تا بہ نزد او آید
 الحق اُمنابے مال ایتام ہر چوں تو حلال زادہ یا بند
 ہرگز زن و مرد کفر و اسلام نفس از تو پلید تر نہ زاین
 طفلان ترا پر مبیہاد تا جو تر و صی بیازمایند
 اطفالِ عنبر نیز تا ز پرورد از دست تو دست پر خدائید
 امیر با غسل از دست خلق می بخورد کہ ز هر دو فرج انگیس تو اندر بود
 عجب کہ در غسل از زہری کند پرہیز حذر کنی گفت از تیر آوز ہر آلود
 شنیدم کہ بیوہ زن نے درد مند ہے گفت و نوح بر زمیں سے نہاد
 ہر آں کہ خدا را کہ بر بیوہ زن تر حسم نباشد ز نفس بیوہ باد
 ہر بد کہ بخود نے پسندی با کس لمن اے برادر من
 گر ما و بر خویش دوست داری دشنام مدہ یہ مادر من
 مقابلت نکند با حجب و پیشانی مگر کسے کہ تہوڑ کسند بنا دانی
 کس یں خطائے پسند کہ دفع دشمن خود توانی و نہ کنی یا کنی و نتوانی
 شنیدہ ام کہ فقیہ بہ منتبانی گفت کہ ہیچ غریبہ داری رسیدہ گفت آرس

انیں صرت دو ہوا گئے۔ گراختیا رکنی
سوال کرد کہ چندیں تفاوت از چہ صفت
بلغت ازاں چہ تو بینی حلال و ملک است
وزاں، و گر پس رانم بغارت آوردند
فقیہ گفت۔ حکایت دراز خواہی کرد
تا سگال را وجوہ پیدا نیست
لقمہ در میان شاں انداز
که تہی گا دیگدگر بدترند

میں
دینی

رباعیات

شب نیست کہ چشم آرزو مند تو نیست
گر تو در گری بجای من بگزینی
ماہی امید غم از شست برت
غمی کہ از دمی بجائے آرزو
از بس کہ بیا زرد دل دشمن دوست
وقتے غم او بر ہمہ دہا بودے
گوئید ہوا بے فضل آزار خوش است
ابریشم زید و نالہ زار خوش است
گویند مرو در پے آں سر و بلند
بے فائدہ چند مہرہ اے دانشمند

میں
میں

میں
میں

میں
میں

میں
میں

دیں جاں بلب رسیدہ در بند تو نیست
من غم نہ تو نشکم کہ مانند تو نیست
بے فائدہ روزم چو شب مست برت
افسوس کہ را بگاہم از دست برت
گوئی بگناہ مسخ کردند شش پوست
اکنوں ہمہ غم ہاے جہاں بردل دوست
پوئے گل و بانگ مرغ گلزار خوش است
اے بے خبراں میں ہمہ بیا ر خوش است
انگشت نامے خلق بودن تا چند
من چوں نژوم کہے برندم بکنند

آہو پرورا کہ شیر دے پے باشد
 بیچارہ چہ اعتماد بر وے باشد
 ایں ملح در آب چہ نہ ہو اند بود
 دیں برت در آفتاب تا کہے باشد
 اں را کہ نظر بر وے ہر کس باشد
 در دیدہ صاحب نظر اں حن باشد
 قاضی بہ دو شاہد بہ ہر فتوای شہ
 در نہ ہر عشق شاہد کے بس باشد
 فرداں ہمہ عمر پارہ برد وختہ اند
 فوٹے ہزار حیدر اند وختہ اند
 فرداے قیامت گناہ ایشاں را
 باشد کہ نہ سود نہ کہ خود سوختہ اند
 بادوست بگرما بہ درم خلوت بود
 دواں روے گلینش گل حمام آلود
 گفتا دگر ایں نے کسے دار دوست؟
 گفتم بہ گل آفتاب نتوان اندود
 چوں صورت خویش تن در کینہ بہ
 دواں کام و دہان لب دندان بگریہ
 می گفت چنانکہ می توانست شنید
 بس جاں بلبا کہ کہیں لب رسید
 اسٹب نہ بیا من روز برے آید
 نہ نالہ مرغان سحر مے آید
 بیدار شستہ ام نظر بر سر کوہ
 تا صبح کے از سنگ بندے آید
 وقت است کہ چشم فتنہ خواہش بیزد
 با د از رخ گل حسن شباہش بیزد
 گل وقت رسیدن آب عطار بیزد
 عطرا بہ وقت رنستن آبش بیزد
 وقت گل روز شادمانی آمد
 ہنگام نشاط و کامرانی آمد
 آن شد کہ بہ سدا نتوانی آمد
 ہر مانند و وقت مہربانی آمد
 ما چاکر آنیم کہ دل برباید
 یا دل بہ کسے دہد کہ جاں آساید
 اں کس کہ نہ عاشق نہ معشوق کس
 در ملک حسد اگر نباشد شاید
 اں گل کہ ہنوز تو بہشت آمد دہد
 نشگفتہ تمام - باد ہر شرب بر دہد

بیچارہ بسے امید در خاطر داشت
 من دوش قضایا و قد لبستم بود
 دیدم کہ ہے کوم لب شیرینیت
 جوں خیل تو صد باشد و خیر تو نیاز
 تمام توانی بر آواز از خصم و مار
 نام مردم اگر ز غم سسرا ز مہ تو باز
 و ر بگر بزم زد دست اسے مایہ ناز
 تار نہ کنور بر نہ اسے مایہ ناز
 ہر چہ نہ کہ را ہم تو دوست و درنا
 کوبے خیران و عجب گویاں را نہیں
 آتہ زنگناہ است کہ من کردم نہیں
 جوں نہ ہر دہرہ شہید را پیر غفرانوں
 با نیک اختر مرستہ نتوان کہ دیہانہ
 یا مجموعہ برین انسگنہ بر خوش
 و ر لایق حسد متہ نہانی بر خوش
 ہمسایہ کہ مہیا ہمسع باشد سویش
 داں را کہ بخوبی کہ چہ بسیہی کویش
 ہر سرفقدے کہ گنزد در غم نہ
 چوں نہ توانم کہ جواں کردم با

ہستید و راز و غم کوتاہ چہ سود
 نا بچ ز حسد ان تو دہم شتم بود
 بیدار چو شتم سہر شتم بود
 خود را بہ جان مے سپارنی نہار
 چوں جنگ نہانی آشتی عیب مد
 خواہی بکشم بجور و خواہی بنوا
 ہر حربہ با کہ تو ہم پیش توے ایم باز
 کوتہ نہ کنم ز دوست دست نیاز
 در راہ ہمیسرم و نہ گردم تو باز
 منسوب کنندم بہ او و چہ ہوس
 منظور میجہ دوست دارد ہر کس
 بر باد دہد و جان گرامی جنوس
 دستے کہ بہ کوتہ نتوان برد ہوس
 تا بند گیت کنم حجاب و نہر خوش
 گو من سہر خوشی برم دشو خوش
 فردوس بریں بود مراد گویش
 دو بخ باشد بہشت و پیلویش
 در بیات او خیر و بسا نہ نصیر
 احسہ کہ ازاں کہ در جوانان گرم

دوست

دوست

دوست

دوست

دوست

دوست

دوست

دوست

دوست

خود را بہ مقام شیریں دانستم
 چوں خصم آمد ہر دو بہتہ نامستم
 گفتم من و صبر اگر بود روز فراق
 چوں واقعہ آفت از خونستم
 شبہا ز ہمہ سلسلہاں مے گریم
 چشم از غم دل بر آسماں مے گریم
 طفل از غم مرغ رفت خوب گریند
 بر غم گزشتہ ہچناں مے گریم
 چوں مادر شہما آثار بیکہ گریم
 یہ زان نہ بود کہ پردہ ہم زویم
 لے خواجہ تو عیب من کن تا من نہ
 عیب تو نگویم کہ یک ازین تیریم
 گر بر رگ جان زشت آیتیریم
 چہ خوشتر از انکہ پیش دستیریم
 دل با تو خصوصت آرزوی کندم
 تا صلح کئی و در کنار تیریم
 مے آئی و لطف و کرم می ہم
 و آسائش جاں و قدرت می ہم
 و آن وقت کہ غایبی ہست می ہم
 بر جا کہ نگہ مے کفایت می ہم
 گفتم کہ اگر چشم بہ دبیر نہ کنم
 صوفی شوم و گوش پس نہ کنم
 دیدم کہ خلاف طبع موزون ہست
 نوبت کردم کہ تو بہ دیگر نہ کنم
 مہ را ز فلک بطرف بام آوردن
 وز زوم کلیسیا بشام آوردن
 در وقت سحر نماز شام آوردن
 بتواں نتواں ترا بدام آوردن
 نہ سرو تاواں گفت نہ خورشید نہ ماہ
 آہ از تو کہ در وصف نے آئی آہ
 ہر کس برہے مے زود اندر علیت
 گرہ جو ہو دے نہ بیکے ایں بہرہ
 لے راہرواں را گذرا نہ کو تب تو نہ
 مابے خبر از عشق دگدگے تو نہ
 ہر تشنہ کہ از دست تو بہتا نہ آب
 از دست تو میر گرد از دہب تو نہ
 اے یار کجائی کہ در آغوش نہ
 دشب بر بالشتہ چوں در ش نہ

نوعی
نوعی

نوعی
نوعی

نوعی
نوعی

نوعی
نوعی

نوعی
نوعی

نوعی
نوعی

نوعی
نوعی

نوعی
نوعی

نوعی
نوعی

نوعی
نوعی

اگر تو اب دوسرے مکان ہم از در گہ برانند
 سلطان چو بہ مترل گدایاں آید
 ازاں بہتر کہ در پہلو بہ مجھو لے نشانند
 گرز بہفت آسمان گزند آید
 گر بر سر نور یا نشیند شاید
 اگر دنداں نہاشد ناں تو اں خورد
 منعم کہ نظر بحال درویش کند
 تو اطلع گر چہ محمود است و فضل بکلیان داد
 گفتیم کہ بر آید آبے از چاہ آید
 بشکر آں کہ تو در خانہ و اہل بیت
 کو تہ نظر اں را بنود خبر عنہم خویش
 گر بلندت کسے دہد شنام
 بشنو کہ من نصیحت پیراں شنودہ ام
 از بہر دل کسے بہت آوردن
 چو بہ غسقی مہاشن ایمن ز بد کو
 صاحب دل و نیک سیرت و علامہ
 کرم بجای فروماندگاں چہ توانی
 فردی نہ بقوت است و شیرینی
 تو بامو نہ شب و باغ آنسی
 پستے کھنے نزد سلیمان برون
 من سخن راست نوشتم تو اگر راست بخوانی
 جرم کلان نہ باشد چو تو شرط بخوانی

اگر تو اب دوسرے مکان ہم از در گہ برانند
 سلطان چو بہ مترل گدایاں آید
 ازاں بہتر کہ در پہلو بہ مجھو لے نشانند
 گرز بہفت آسمان گزند آید
 گر بر سر نور یا نشیند شاید
 اگر دنداں نہاشد ناں تو اں خورد
 منعم کہ نظر بحال درویش کند
 تو اطلع گر چہ محمود است و فضل بکلیان داد
 گفتیم کہ بر آید آبے از چاہ آید
 بشکر آں کہ تو در خانہ و اہل بیت
 کو تہ نظر اں را بنود خبر عنہم خویش
 گر بلندت کسے دہد شنام
 بشنو کہ من نصیحت پیراں شنودہ ام
 از بہر دل کسے بہت آوردن
 چو بہ غسقی مہاشن ایمن ز بد کو
 صاحب دل و نیک سیرت و علامہ
 کرم بجای فروماندگاں چہ توانی
 فردی نہ بقوت است و شیرینی
 تو بامو نہ شب و باغ آنسی
 پستے کھنے نزد سلیمان برون
 من سخن راست نوشتم تو اگر راست بخوانی
 جرم کلان نہ باشد چو تو شرط بخوانی

کتبت لیقۃ الذکر فی اہم بعدی فیاذہ الجلال اغفر کا تبہ السعدی

تکلم

مطائبات نہرلیات و مضحکات

شیخ کے کلمات کا سب سے اخیر حصہ مجموعہ نہرلیات ہے جو میں تبیین صغی سے زیادہ نہ ہوگا۔ یہ مجموعہ فی الحقیقت شیخ کے عارضی کمال پر ایک نہایت پرہیزگار جوشیخ کی شان سے نہایت بعید اور اس کے فضل و کمال و بزرگی کے بالکل منافی ہے۔ اس میں زیادہ تر نظم اور کسی قدر نثر ہے اور کہیں کہیں عربی عبارت بھی ہے۔ حضرت نے اس حصے میں اپنی شیخوخت اور تقدس کو بالائے طاق رکھ کر خوب آزاد دی اور بے باکی سے دل کھول کر فحش اور نہرلی کی داد دی ہے جس پر ہرگز یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ یہ تیوج اور لغو اور بیہودہ کلام اسی شخص کا ہے جس کے نتائج افکار سے گلستاں اور بوستاں جیسی بے بہا کتابیں موجود ہیں۔ آدمی کا ظاہر اور ناقص ہونا یہی اس کے انسان ہونے کی علامت ہے۔ اور اس کے اقوال و افعال کا تضاد و امتخلاف اور ان کا ہمیشہ ایک ضابطے اور ایک قانون کے موافق سرزد نہ ہونا یہی وہ چیز ہے جو اس کو دیگر حیوانات سے تمیز دیتی ہے۔ انسان کے ایک نادان بچے کی حرکتوں سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ جس کی ایک حرکت پر بے اعتبار پیار کرنے کو جی چاہتا ہے اور دوسری حرکت پر مد سے زیادہ غصہ آتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شیخ کی طبیعت پر حرافت اور مزاح غالب تھا۔ اور جب یہ صفت مد سے گزرتی جاتی ہے تو اس سے فحش اور نہرلی پیدا ہوتا ہے۔ مگر شیخ نے اس مجموعے کے شرعی میں چند سطریں معذرت آمیز عربی عبارت

میں لکھی ہیں جو قابل لحاظ ہیں وہ لکھتا ہے:-

أَلَمْ يَنْبَغْ لِمَنْ تَعْبَضُ أَبْنَاءَ الْمَلُوكِ أَنْ أَصْنَعَتْ لَهُ كِتَابًا فِي الصَّرَفِ عَلَى طَرِيقِ
الشُّوَرِ كَيْ فَلَمْ أَرْجِبْهُ كَهَذَا دَنِي بِأَقْتَلِ فَلَا جُلْ ذَلِكَ أَحْبَبْتُ أَمْرًا وَأَنْشَدْتُ
هَذِهِ الْأَبْنِيَّاتِ وَأَنَا أَسْتَغْفِرُ اللَّهَ الْعَظِيمَ **یعنی** ایک بادشاہ زادے نے
مجھ کو اس بات پر مجبور کیا کہ میں اس کے لیے ایک کتاب حکیم توسرینی کی روش پر ہزل
میں لکھوں میں نے مانا اس پر اس نے مجھ کو قتل کی دھمکی دی۔ اس لیے مانا پڑا
اور یہ اشعار لکھے اور میں خدا سے بزرگ سے توبہ و استغفار کرتا ہوں *

شیخ کا عذر جہاں تک ہماری رائے ناقص میں آتا ہے بہت قرین قیاس معلوم
ہوتا ہے شیخ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے ہمیشہ سیر و سفر میں رہتا تھا۔ تانا و سے لے کر
رُوم و مصر و حبش تک اُس کی جولاں گاہ تھی۔ اُس کی شاعری اور نکتہ سنجی کا شہرہ
اُس کی زندگی ہی میں دُور دُور پہنچ گیا تھا۔ مسلمان امیرزادوں اور بادشاہوں
کی صحبتوں میں لہو و لب اور سخاوت و سخاوت کی بنیاد پر چلی تھی۔ پس اگر کسی بلا لائق
بادشاہ زادے نے شیخ کی طرافت اور بذلہ سنجی کا شہرہ سن کر اس خیال سے
کہ ہمیشہ گزرتے صحبت کے لیے ایک مجموعہ ہزل و فحش موجود ہے۔ شیخ کو ان ہنوت
کے لکھنے پر مجبور کیا ہو۔ تو کچھ تعجب کی بات نہیں ہے اور چونکہ اس مجموعے میں
صریح فحش اور علانیہ پھلکڑے کے سوا بافرہ اور لطیف خیالات جیسے کہ شیخ کے کلام کی
عام خاصیت ہے، بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً یہ
تمام ہزلیات دل کی آنچ اور طبیعت کی اُتنگ سے نہیں بلکہ محض نفرت
کراہت کے ساتھ لکھی گئی ہیں *

ایران میں ہزل و محش کی شاعری دورۂ غزنویہ کے شعرا سے براہِ چلی آتی تھی۔ اور یہ طریقہ اس قدر عام اور بے عیب ہو گیا تھا کہ افاضل شعرا کی عظمت اور بزرگی میں اس سے کچھ فرق نہ آتا تھا۔ اکثر حاجی اور ہزار حکیم کے لقب سے ملقب ہوتے تھے اور اب تک ہوتے ہیں۔ جیسے حکیم انوری۔ حکیم خاقانی۔ حکیم شفقانی۔ حکیم قاتانی وغیرہ وغیرہ۔ سوزنی بھی جو چھٹی صدی کا شاعر ہے۔ اور جس کا ذکر شیخ کی مذکورہ بالا عبارت میں ہے۔ حکیم سوزنی کہلاتا تھا۔ اس کا ہزل اور محش انتہا درجے کو پہنچ گیا تھا۔ اُس نے حکیم سنائی کی بہت سی جویں لکھی ہیں اور حکیم سانسب نے بھی ایسا بہت شینت و تقدس تنگ آکر اُس کے جواب میں ایک ایسی جامع و مانع گالی تصنیف فرمائی ہے جو سوزنی کی عمر بھر کی گالیوں اور پیکڑوں کا جواب ہو سکتی ہے۔ حکیم ابوالعالی نجوی جو منوچہر نوشیرواں شاہ کے عہد میں پخت کا ملک الشعرا تھا۔ باوجودیکہ وہ حکیم خاقانی کا مرنی اور خسر تھا اُس کے اور خاقانی کے باہم ایسی رکیک اور نالائق جو بازی ہوئی تھی جس کی تصحیح کرنے سے شرم آتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جو ہرائی سوسائٹی میں اس قدر عام اور بے عیب ہو جائے اُس سے بالکل پاک اور مبرا رہنا بشر کی معمولی طاقت سے باہر ہے اور اُس کے ارتکاب پر ایسا سخت مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ جس کا کہ وہ عیب فی نفسہ مستحق ہے۔

ظاہراً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نے عقوان شباب میں جو کہ سنوخی اور بے یابی کا زمانہ ہے کسی توقع پر یہ مخافات بھی لکھ دی ہوگی۔ اور ایسا کم و بیش ہر شخص سے ظہور میں آتا ہے۔ مگر کوئی شخص ایسے بیہودہ اور لغو کلام کو اپنی تصنیفات میں

شامل کر کے اپنی طرف منسوب اور اپنے نام سے شائع نہیں کرنا چاہتا۔ شیخ نے بھی یقیناً ایسا ہرگز نہ چاہا ہوگا۔ مگر چونکہ وہ زمرہ مشائخ و عرفا میں سے گنا جاتا تھا اور معتقدین کے نزدیک اُس کا ہزل بھی انوار و برکات سے خالی نہ تھا۔ اس لیے کسی بزرگوار نے اُس کی وفات کے بعد اس ناشدنی مجموعہ کو بھی تبرکاً اور تہمتاً گلیات میں داخل کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ گلستاں کے قریب ہونے سے پہلے لکھا جا چکا تھا۔ کیونکہ اس کے چند اشعار جن میں زیادہ ہزل نہیں ہے شیخ نے گلستاں میں اپنے اپنے موقع پر نقل کیے ہیں +

ہم کو بہت تجسس سے چند رباعیاں اور نظمیں اس مجموعہ میں ایسے ہی ہیں جنہیں سے پاک میں سو وہ یہاں نقل کیے جاتے ہیں +

رباعیات

آں عہد بیاد داری و دولت و داد کہ عاشق بیچارہ نے کردی یاد
آنکہ بگر یعنی کہ کس چوں تو بنوؤ و امر و زیاد می کہ کس چوں تو مباد
آں ماہ کہ گفتے ملک رحمان ست امیں باد اگرش نگہ کنی شیطان ست
روئے کہ چو آتش بزمستال خوش بود امر و چو پستیں تباستان ست

قطعات

چو خویش تن تواند کہ مے خورد قاضی ضرورت است کہ بردیگراں بگرے سخت
کہ گفت پیرہ زن او میوہی کند پرہیز دروغ گفت۔ کہ دستش غیر مدبہ درخت

مرد کے غمت ہو درجیوں کو سمرقند ہو دینداروں
 بانگ سے کرد و زارے نالید کاے دین کا کلاہ و دستار
 حریف عمر بے زور و در فوج بوقت مرگ پشماں ہی خورد گوشت
 کہ تو بہ کردم و دیگر گشت تو اہم کرد تو خود در توانی بریش خویش محنت

عربی قصائد و مقطعات

کلیاتِ شیعہ میں بین صنفی کے قریب قصیدے اور قطعے بھی شامل ہیں اور ان کے
 سوانحیات میں عربی اشعار اور مصرعے کثرت سے موجود ہیں۔ گلستاں میں بھی جیسا کہ
 اُس نے خاتمے میں تصریح کی ہے۔ تقریباً تمام عربی اشعار اُسی کے ہیں۔ قطع نظریں
 سے کہ اُس کی عمر کا ایک بڑا حصہ دیارِ عرب میں بسر ہوا تھا اور عربی زبان بہتر مادری
 زبان کے ہو گئی تھی۔ اُس کے تمام فارسی اور عربی کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ تفصیل
 علم کے بعد اُس نے زیادہ تر اپنی توجہ دینیات اور تصوف اور علمِ ادب میں مصروف
 کی تھی۔ گو اُس کا عربی کلام بہت تھوڑا ہے۔ مگر جس قدر ہے وہ ایسا ہی عجیب
 کہ ایک مشافی اور ماہرِ ادب کا ہونا چاہیے یا اس ہمہ وہ عربی شعریں شاعری کا اُٹا
 نہیں کرتا۔ چنانچہ بعد اؤ کے مرثیے میں لکھتا ہے :-

وَالشُّعْرَاءُ عِندَ اللَّهِ كَسَتْ بُمْتَجَجٍ جَدَائِدُ شَاعِرِي كَادَعُوهُ نَبِيَّ كَرْتَا -
 وَلَوْ كَانَ عِنْدِي مَا يَبَالِي مِنْ مَجْزٍ أَجْزِ بَرِّ كَلَامِ مِنْ وَهْ جَادُوْهُ مَوْجُوْدُ بَعْدِ
 بَابِلِ مِنْ مَوْجُوْدِ كَحَا

ہنالک نقادون علیاً وخبیرۃ یہاں علم اور ہفت کی ہوسے پر کئے والے

وَمُنْتَقِبُوا الْقَوْلَ الْجَمِيلَ مِنَ الْعَجْرِ اور عمدہ کلام کو بُرے کلام میں سے چھاننے والے موجود ہیں +

جَرَتْ عَبْرَاتِي فَوْقَ حِدِّي كَأَبَةٍ سوزِ دل کے سبب میرے آنسو چہرے پر ٹپکے
فَانْشَأَتْ هَذَا فِي قَفْصِيَةِ مَا عَجَزِي سُوئیں نے یہ قصیدہ اس سرگزشت کے بیان میں لکھ لیا +

وَلَسَبَقْتَنِي سَادَةٌ جَلَّ قَدْرُهُم اُردی رتبہ لوگ اس مضمون میں مجھ سے
لَمَّا احْسَنْتُ مَعِيَ فُجَاؤُزُهُ الْقَلْدُ سبقت کرتے تو البتہ مجھ کو اپنے رتبے سے تجاوز کرنا زیبا نہ تھا +

بہر حال اُس کا عربی کلام جس قدر ہے اور جیسا ہے غنیمت ہے اور اُس سے شیخ کی شاعری کا رتبہ سوا یا بلکہ ڈیوڑھا ہو گیا ہے۔ اب ہم اُس کے ایک طولانی قصیدے میں سے جو کہ اُس نے خرابے بند اوپر لکھا ہے کچھ اشارے بطور نمونے کے اس مقام پر نقل کرتے ہیں :-

حَبَسْتُ مَجْجَفِي الْمَدَامِجَ لَا تَجْزِي میں نے اپنی ہلکوں میں آنسوؤں کو روکا تھا
فَلَمَّا طَغَى الْمَاءُ اسْتَطَالَ عَلَى الشَّكْرِ کہنے نہ پائیں پر جب پانی نے طغیانی کی تو اُس ہند کو توڑ ڈالا +

نَسِيتُ مَهَبًا بَعْدَ ادْبَعْدِ خَرَابَا کاش ایسا ہوتا کہ ہند او کی شاہی کے بعد اُس کی
تَمَتَّتَتْ لَوْ كَانَتْ كَهْمًا عَلَى قَبْرِی ہوا کا جھوکا میری قبر پر گزرتا +
لَا تَهَاوِ النَّفْسَ عِنْدَ اَدْوَى الشَّيْءِ کیونکہ عقلمندوں کے نزدیک مرنا ناممکن
اَحَبُّ لِمَنْ مِمَّنْ يَشِيءُ مُنْتَقِبِ الْعَدَمِ جینے سے بہتر ہے +

دُجَرْتُ طَبِيبًا حَسْبُ نَبْضِي مُدَاوِيًا مَيِّسَ نِي فِي طَبِيبٍ كَوَجِبَ كَرَأْسِ عِلَاجِ كِي بِمِيرِي
اِيك كَمَا شَلَوَايَ مِنْ مَرَضِي بِمِيرِي نَبْضُ كُوْخِيُوْا جَهْرُك دِيَا كَرَا بِنَا كَامُ كَرُجُوْا كَوَا
مرض کی شکایت نہیں جو اچھا ہو سکے +

لَوِصْتُ اصْطَبَا لَاحِثَ كُنْتُ مَعَاوَا مَيِّسَ نِي فِي طَبِيبٍ كَوَجِبَ كَرَأْسِ عِلَاجِ كِي بِمِيرِي
وَحَذَا فِرَاقِي لَا يَتَعَالَجُ بِالتَّعَلُّمِ كِي لَہے مگر یہ ایسی جدائی ہے جس کا علاج
صبر سے ممکن نہیں +

وَلَا تَسْأَلُونِ تَمَّاجِرِي يَوْمَ خَصْرِ مَيِّسَ نِي فِي طَبِيبٍ كَوَجِبَ كَرَأْسِ عِلَاجِ كِي بِمِيرِي
وَزَلَّتْ مِمَّا لَيْسَ يَخْلُ فِي حَصْرِ كُوْخِيُوْا جَهْرُك دِيَا كَرَا بِنَا كَامُ كَرُجُوْا كَوَا
نہیں آسکتا +

أَدْرَيْتَ كُوْخِيُوْا دَسَ الْمَوْتَ حَتَّى كَانَتْهُ تَحْرَابُ مَرْكٍ كِي جَامُ رُوشِ مِي لَئِي لَئِي مِيَاں كِي
رُوشُ الْاَسَارِي تَمُزُكُنْ مِي الشُّكْرِ كِي قِيدِي كَشْتُوں كِي سَمَرُ تَرْبَتِي ہوئے ایسے معلوم
ہوتے تھے گویا نشے میں جنجیش کر رہے ہیں +

بَكَّتْ مَجْدُكَ الْمُسْتَضْعِرِيَّةُ نَذْبَةً عَلَمَاءُ الرَّاسِخِينَ بِرُجُوْا كَوَا
وَالنَّشْتِي مَرَسَ الْمُسْتَضْعِرِيَّةُ كِي دِلَوَارِيں
زار زار زور رہی ہیں +

فَمَا يَزِيدُنِي بَعْدَ هَمْزِيَّوَا دِهَا اُنْ كِي بَعْدُ دَوَاتِيں اِنِي سِيَاہِي كِي اَنَسُوْا
وَبَعْضُ قُلُوبِ الْاِنَاسِ اَمْلَاقُ مَنَاجِيْرُ سِي رُوْنِي ہوں مگر بعض لوگوں کے دل
دوات سے زیادہ سیاہ ہیں +

كُوْا كَبْ دَهْرِي لَيْسَ كِي مَرِيْتِ قَبْلَمَا يَرِ زَمَنُ كِي سَحْتِ حَادِثِي ہوں کاش میں

وَلَمْ أَرَعْدًا وَان السَّفِيهَ عَلَى الْحَبَرِ
 اُن سے پہلے مر جاتا اور جاہلوں کا ظلم
 دانشمندوں پر نہ دیکھتا +

وَوَقَفْتُ بُعِيَادًا اِنْ اَرْتَبُ دِجْلَةً
 میں نے شہر عبادان میں ٹھہر کر دجلے کے
 مکمل دم قان تَسْمِلُ اِلَى الْبَحْرِ
 پانی کو دیکھا کہ بکتر خون کے مانند سمندر
 کی طرف بہتا تھا +

وَفَائِضُ دَمِي فِي مُصِيبَةٍ وَاسِطِ
 تیرے آنسو جو شہر واسط کی مصیبت میں
 يَزِيدُ عَلَى مَدَا الْبَحْرِ وَالْحَزْنِ
 جاری ہیں خلیج فارس کے تہ و جز کو
 اور بڑھا دیتے ہیں +

وَهَبْ اَنْ دَارَ الْمُلْكِ تَرْجِعَ عَامِرًا
 فرض کرو کہ دار الخلافہ پھر آباد ہو اور علماء کے
 وَيُقَسِّلْ دُجْدَا الْعَادِينَ عَنِ الْعَفْرِ
 چہرے غبارِ ذلت سے پاک کیے جائیں +
 فَاَيْنَ بَنِي الْعَاسِ مُفْتَعَرِ الْوَدَى
 لیکن بنی عباس جن سے عالم کو فخر تھا جن کے
 ذُووَالْمَخْلَقِ الْمَرْفَعِ وَالْعَوْرِ الْكُحْرِ
 اخلاق برگزیدہ اور پیشانیوں نورانی تھیں
 کہاں سے آئینگی +

عَدَا سَمْرًا بَيْنَ الْاَنَامِ حَتَّمُ
 اُن کا ذکر اب دنیا میں ایک افسانہ ہو گیا اور
 وَذَا سَمْرًا يُدْمِي الْمَسَامِعَ كَالشَّمْرِ
 یہ وہ افسانہ ہے جو کانوں کو بھپیوں کی نوک
 کی طرح خون آلودہ کرتا ہے +

وَفِي الْخَبَرِ الْمُرَدِّي دِينَ مُحَمَّدٍ
 حدیث میں آیا ہے کہ دین محمدی پھر غریب
 يَبْعُو دُغْرِيًّا مِثْلَ مُبْتَدَأِ الْاَلَامِ
 ہونے والا ہے جیسا کہ ابتداءِ حال
 میں وہ غریب تھا +

أَعْرَبَ مِنْ هَذَا يَسُوعُ كَمَا بَدَأَ كَيَاوہ اس حالت سے بھی زیادہ غریب ہو گیا
وَسَبَّحَ دَاوُدَ السَّلَامَ فِي أَجْدَاءِ الْكُفْرِ ہے کہ تمام دارالاسلام کفر کے آتے ہی
غریب ہو گیا +

أَتَدَّكِرُنِي أَعْلَى الْمَنَابِرِ خُطْبَةً كَيَا سبزیوں پر خطبہ پڑھا جائیگا اور مستعصم باللہ
وَمُسْتَعَصِمٌ بِاللَّهِ لَمْ يَكُنْ فِي الذِّكْرِ کا اُس میں ذکر نہ ہو گا +
ضفادع حول الماء تلعب فرحة كيا اُس پر صبر ہو سکتا ہے کہ میڈک پانی کے
اصبر على هذا ويونس في العظم ادھر ادھر خوشی سے کھلتے پھریں اور
يونس پانی کی تریں ہو +

تَحِيَّةٌ مُشْتَقِي وَالْفَتْرَةُ مَسَاقٍ كاسلام اور ہزاروں رحمتیں
على الشهداء الطاهرين من الزور ان خمیدوں پر جو گناہوں سے پاک تھے +
هَيْدَانَهُمْ كَأَسْ أَلْمَنِيَّةِ مُتَرَعِّمًا موت کا بہاب پیالہ اور جو کچھ کہ اُس میں
وَمَا فِيهِ عِنْدَ اللَّهِ مِنْ عَظْمٍ لَا جَرَّ خدا کی طرف سے اجر عظیم ہے اُن کو گوارا
ہو جیو +

عَلَيْهِمُ سَلَامٌ اللَّهُ فِي كُلِّ لَيْلَةٍ ہمیشہ اُن پر شام سے صبح تک زور
بِمَقْتَلِ دُورَاءِ إِلَى مَطْلَعِ الْفَجْرِ کی قتل گاہ میں خدا کی رحمت نازل
رہیو +

وَلَيْتَ صَاحِبِي صَمَّ قَبْلَ اسْتِمَاعِهِ کاش ایسا ہوتا کہ قید میں محلوں کے بے پردہ
بہتک اساتیر المحارم فی الاسہا ہونے کی خبر سننے سے پہلے میرے کان
بہرے ہو جاتے +

وَكَانَ مَسَاحِ الْأَصْحَابُ قِيَامَةً قِيدِ كِي صُجَّ نُوْبِ قِيَا سَتِ كَا دِنِ تَحَا كَا اَتَمِ سِ
 عَلٰی اَمِّ شَعْنِ شَسَا قِ اِلٰی الْحَشِ سِرْمِ نَا كِ دَا لَے ہوئے مِیْدَانِ حَشْرِ كِ
 طَرَفِ ہِكَائِی جَاتِی تھیں *

وَمُسْتَضِيحٌ يَّا لِّلْمُرَّةِ فَانْصَرَمَا وَهَسَتْ لَوْكَ فَرَادِ كَرْتِے تَحَے كُو دِہَائِی ہِے مُرَوْتِ
 دَمِنْ مُضِيحِ الْعَصْفُ بَيْنَ يَدَيْ كَعْضِ كِ كُو ئِ مَدْرُكِ - مَكْرَا زِ كَے بَنَجِے مِیْسِ چُرَا كِ
 فَرَا دِ كُو كُو نِ پُتِجَتَا ہِے *

يَسَاقُونَ سَوَاقَ الْمَرْغِي كَبِيرِ الْفَلَاحِ جَوِ لَوْكَ زَجْرَا وَدَهْلِي سُنْتِے كَے عَادِي تَحَے
 عَزَا ئِزْ قَوْحِمَ لَا يَعُوذُونَ بِالْزَجْرِ اُنْ كَے حَرِمِ مَحْرَمِ صَحْرَا مِیْسِ بَكْرِيُوں كِ طَحِ
 ہِكَائِے جَاتِے تَحَے *

جَلِيلٌ سَبَا يَّا مُسَا فَرَاتٍ وَجُوْهُمَا جَوِ لَوْ كِیَا مِیْسِ پَرْدِے مِیْسِ چَا دَرُوں ہِے چَہِے
 كَوَاعِبُ لَا تَبْرُزْنَ مِنْ حِلِّ الْخَدِّ بَاہِرِ نِكَالَتِی تھیں اُنْ كُو كُھلے مُنْہَا سِرِ كَے
 لَے گئے *

تَقُومُ وَتَخْفُو فِي الْمَعَا جِرِ وَاللَّوِي دَہْ كُڑِی ہوتی مِیْسِ اُور چَا دَرُوں اُوٹِیوں كِ
 وَهَلْ يَخْفَى مَشَى الْمَوَاعِمِ فِي الْوَعْرِ دُھلَانُوں مِیْسِ مُنْہَا چھِپَاتِی ہِیں مَكْرَا نِ مِیْسِ
 رَسْتُوں مِیْسِ نَا زَمِیْنُوں كِ چَالِ كَبِ

جُھُپ سَكْتِی ہِے * اَسْ سَے پہلے مِیْرِی فِكْرِ جِیْسِ تھی تُو جَاتَا
 لَقَدْ كَانَ فِكْرِي قَبْلَ ذَلِكَ تَارِي مَكْرَا كِ اِیْسَا اَمْرِ عَظِیْمِ حَا دِثِ ہُوَا جَوِ ہِے
 فَاحْدِثْ اَمْرًا اَلَا يَحِيطُ بِهِ فِكْرِي فِكْرِ كَے اَحَا طِے سَے بَاہِرِ ہِے *

وَبَيْنَ يَدَيَّ صَرْفَ الزَّمَانِ حَكِيمٌ
مُغَلَّغَةٌ أَيْدِي الْقِيَاصِ حَبْرُ الْحَبْرِ
زمانے کی گردش اور حکومت کے سامنے
شہنشاہوں اور اناؤں کے ہاتھ بندے
ہوئے ہیں *

نَعُوذُ بِعَفْوِ اللَّهِ مِنْ نَارِ فِتْنَةٍ
تَاجٍ مِنْ قَطْرِ الْبِلَادِ إِلَى الْقَطْرِ
خدا کی پناہ ہے فتنے کی اُس آگ سے جو
دنیا کی ایک جانب سے دوسری جانب
تک بھڑکتی چلی گئی *

بَدَلًا وَتَعَالَى مِنْ خُرَاسَانَ قُسْطَلُ
فَعَادَرُكَ مَالًا لَا يُزُولُ عَنِ الْبَدَنِ
خراسان سے ایک غبارِ نودار ہو کر بلند ہوا
اور ایک گھٹنور گھٹائیں گئی جو چاند پر سے
رہنے والی نہ تھی *

دَعَى اللَّهُ إِنْسَانًا نَاقِظًا بَعْدَهُمْ
لَا أَنْ مَصَابِئُ زَيْدٍ مِنْ جَزَعِ الْعَمْرِ
خدا احیت کرے اُس شخص کی جو دولت
بنی عباس کے بعد خوابِ غفلت سے بیدار
ہو گیا کیونکہ زید کی مصیبتِ عمر کے
لیے تازیانہ ہے *

وَسَائِلُ مَلَاحٍ يُقْتَفِيهِ ذَوَالِ
رِسْوَى مَلَكَوْتِ الْقَائِمِ الصِّدِّيقِ
خدا بے نیاز و بچانہ کے ملک کے نوا
ہر ملک اور سلطنت کے پیچھے اُس کا
دوال لگا ہوا ہے *

إِنَّمَا كَانَ بَعْدَ الْمَوْتِ لَا فَرْقَ بَيْنَنَا
فَلَا تَنْظُرَنَّ لِلنَّاسِ بِالنَّظَرِ الشَّيْءِ
جب کہ مرنے کے بعد ہم سب میں کچھ فرق
نہ رہے گا تو لوگوں کو تکبر کی نگاہ سے
مت دیکھ *

وَجَارِيَةِ اللَّهِ نِيًّا نَعُوْ مَةً كَفَّهَا
محسنہ لکھنا الکلب ذوالظفر
کئے کی طرح معشوقہ دنیا کی ہتھیلیاں تو
نرم نرم اچھی معلوم ہوتی ہیں لیکن اس کے
ماخن تیز ہیں *

وَلَوْ أَنَّ ذَا مَالٍ مِّنْ لِّمَوْتٍ حَالِيَا
لَكَانَ جَدِيْرًا بَالِغًا طَمِيْمًا وَكَبِيْرًا
اگر مال و دولت والا موت سے خالی
ہوتا تو البتہ بڑائی اور کبر کرنے کا
مستحق تھا *

رَبِّجْتَ الْهَدْيَ اِنْ كُنْتَ عَامِلًا صَالِحًا
وَ اِنْ لَّمْ تَكُنْ وَالْعَصْرُ اِنَّكَ لَكَيْ حَسْبُ
اگر تو نے نیک عمل کیے تو ہدایت کا
نفع اٹھالیا ورنہ کچھ شک نہیں
کہ ٹوٹے میں رہا ہے

عَلَى الْمَرْءِ عَادَ كَثْرَةُ الْمَالِ بَعْدُ
وَ اِنَّكَ يَا مَعْرُوْرٌ تَجْمَعُ الْفَخْرَ
مرنے کے بعد بہت سا مال چھوڑ جانا آدمی
کے لیے تنگ کی بات ہے مگر بے غافل تو
اٹا فخر کے لیے مال جمع کرتا ہے *

مَفَا لَهِ عَنَّا مَا مَضَى مِنْ جَرْمِيَةٍ
وَمِنْ عَلَيْنَا يَا بَجِيْلٍ مِنَ السُّفْرِ
خداے تعالیٰ ہماری گزشتہ خطا میں
معاف فرمائے اور ہمارے عیب بالکل
چھپا کر ہم پر احسان کرے *

خاتمہ

شیخ کے عام حالات اور اُس کی عام شاعری پر اجمالی نظر

شیخ ایک نہایت صحیح المزاج قوی اور جفاکش آدمی تھا۔ اُس کے توئے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اُس نے دس بارہ حج پیادہ کیا کیے تھے اور اپنی عمر کا بہت بڑا حصہ صحرا و نوردی اور بادیہ چمپائی میں بسر کیا اور ایک سو تالیس برس کے قریب عمر پائی +

اُس نے صرف پیادہ پا ہی سفر نہیں کیے بلکہ بعض اوقات ننگے پاؤں چلنے کا بھی اتفاق ہوتا تھا۔ جس طرح اکثر اہل سلوک نفس شکنی کے لیے اپنے مشائخ کے اشارے سے سالہا سال اونے درجے کے کام اور محنتیں کیا کرتے ہیں اُس نے بھی بیت المقدس اور اُس کے گرد و نواح میں ایک مدت تک سقائی کی تھی +

اُس کا مذہب جیسا کہ خود اُس کے کلام سے ظاہر ہے تسنن معلوم ہوتا ہے۔ لیکن جس طرح اکثر صوفیہ کی نسبت تشنچ کا لہان کیا گیا ہے اُس کو بھی قاضی نور اللہ شوشتری نے مجالس المؤمنین میں شیعہ لکھا ہے۔ ہم اُس کے کسی خاص مذہب کا غموت دیکر ایک ایسے شخص کو جو مقبول فریقین ہے ایک گروہ کا مقبول اور دوسرے گروہ کا مردود بنانا نہیں چاہتے۔ بڑی بات یہ ہے کہ وہ

بے تعصب تھا اور یہی اُس کے ناجی ہونے کی دلیل ہے *
اُس کو تذکرہ نویسوں نے اہل باطن و صوفیہ میں سے شمار کیا ہے۔ اُس کے
کلام سے بھی جا بجا یہی مترشح ہوتا ہے کہ وہ اس رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ بیشک
وہ صوفی بھی تھا اور واعظ بھی تھا۔ مگر آج کل کے مشائخ اور واعظین کے
برخلاف ایک نہایت بے تکلف، کھلا ڈالا یا رہا باش۔ ہنسورہ، ظریف، ریا اور نہیں
سے وہ رمیدہ حاساد و مسلمان تھا۔ اُس کو آج کل کے حضرات کی طرح اپنے
تئیں لوازم بشریت سے بالکل پاک ظاہر کرنا اور تہ تکلف مقدس فرشتوں کی
صورت میں جلوہ گر ہونا ہرگز نہ آتا تھا۔ وہ شاعری میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا مگر
مشرق کے عام شعرا کی طرح حریص اور لالچی نہ تھا۔ اُس نے مثل ظہیر، رشید،
حقانی اور انوری وغیرہم کے بادشاہوں کی مداحی اور امیروں کی بھٹی کرنے کو
اپنی وجہ معاش نہیں بنایا تھا۔ باآئندہ وہ امرا اور سلاطین سے ملتا بھی تھا۔ اور
اُن کی طرح میں قصیدے بھی لکھتا تھا اور جو کوئی عقیدت یا محبت سے اُس کی تذکرہ کرتا
تھا وہ لے بھی لیتا تھا۔ اُس کے عام مدحیہ قصائد کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے
کہ وہ یہ قصیدے کس غرض سے لکھتا تھا۔ زیادہ تر اُس کے قصیدے ایسے ہیں
جن کو قصیدہ گوئی کے مشرقی مہول کے موافق بہت مشکل سے قصیدہ کہا جاسکتا
ہے۔ امیروں سے وہ اس لیے بھی زیادہ تر میل جول رکھتا تھا کہ اکثر اُسکی سفارش
سے جیسا کہ گلستاں کی بعض حکایتوں سے پایا جاتا ہے غریب آدمیوں کے کام
نکل جاتے تھے۔ خود داری اور غیرت اُس میں ایسی تھی کہ نہایت ضرورت
اور احتیاج کے وقت بھی وہ وضع کو ہاتھ سے نہ دیتا تھا۔ جیسا کہ اسکندریہ کے

قحط میں اُس سے ظہور میں آیا۔ خلقت کی خیر خواہی اور ہمدردی خدا سے قلمائے
 نے اُس کی سرشت میں ودیعت کی تھی۔ اُس کے نصاب اور مواظبت اور مہرگز اس
 قدر مقبول نہ ہوتے، اگر انسانی ہمدردی کا جوش اُس کے دل میں نہ ہوتا۔ اُس نے
 اپنی زبان اور قلم کو پسند و نصیحت کے لیے وقف کر دیا تھا اور حق بات کہنے سے
 خطرناک موقعوں پر بھی نہ چوکتا تھا۔ کوئی شخص کسی چیمہ میں کامل نہیں
 ہو سکتا۔ جب تک اُس میں دو باتیں جمع نہ ہوں ایک جو ہر فطری۔ دوسرے رہنے
 کے ایسے اتفاقات جو اُس کے جلا کا باعث ہوں۔ شیخ کی ذات میں جس قسم
 کی قابلیت تھی اُسی کے موافق اُس کو اتفاقات پیش آئے تھے۔ جس شہر میں
 وہ پیدا ہوا تھا وہ خود ایک مروج خیر خطہ تھا جہاں ہونہار بچوں کو خود بخود درج
 کمال کی ترغیب ہونی چاہیے تھی اور بے پردی اگرچہ اکثر صورتوں میں کوار کی
 اور اجری کا سبب ہوتی ہے۔ لیکن بسا اوقات ایسی مجبوری اور سبکی کی
 حالتیں غیرت مند اور جفاکش لوگوں کے حق میں ترقی اور رشد کا باعث ہوئی
 ہیں۔ جس مدرسے میں وہ حسن اتفاق سے تحصیل کے لیے پہنچا وہ تمام مدارس
 اسلامیہ میں ممتاز اور سربراہ آورہ تھا۔ اور جس دارالکھلافہ میں وہ مدرسہ واقع
 تھا وہاں کی سوسائٹی اُس وقت تقریباً تمام دنیا کی سوسائٹیوں کی نسبت
 زیادہ شایستہ اور مہذب تھی۔ اُس نے صرف درس و کتاب ہی سے استفادہ
 حاصل نہیں کیا تھا۔ بلکہ زمانے نے بھی اُس کی تادیب خاطر خواہ کی تھی۔ اُس کی
 عمر کا ایک بہت بڑا اور مفید حصہ نہایت کٹھن اور دور و دراز سفر کرنے اور دنیا
 کے عجائبات اور قدرت کی نیرنگیاں دیکھنے میں بسر ہوا تھا۔ سلطنتوں کے

پئے درپے انقلابات اور ملکوں کے متواتر تغیرات۔ ظالم بادشاہوں اور بے رحم
 عالموں کے ظلم و ستم دیکھتے دیکھتے بنی نوع کی دلسوزی اور ہمدردی اُس کی طبیعت
 میں راسخ ہو گئی تھی۔ بیسیوں خاندان اُس کے سامنے بنے اور بیسیوں بگڑ گئے
 ایک بار جیسا کہ گلستاں میں مذکور ہے شام میں اس کے روبرو ایسا انقلاب
 ہوا کہ وزیروں کی اولاد بھیک مانگنے لگی اور روستا زادے وزارت کے درجے
 کو پہنچ گئے۔ ساتویں صدی میں جس میں کامل عقل و ہوش کے ساتھ اُس نے
 انیسویں برس بسر کیے تھے۔ عجیب و غریب تماشے اُس کی نظر سے گزر گئے۔ سلطان
 کردیہ کا خاندان جن کی سطوت و جلالت، ایشیا، افریقہ اور یورپ میں یکساں
 مانی جاتی تھی اسی صدی میں تمام ہوا۔ سلاجقہ، قونیہ اور خوارزم شامیوں کی
 نہایت سخت لڑائی جس نے دونوں سلسلوں کو مضحل کر دیا۔ اسی صدی میں
 ہوئی۔ پھر خوارزمیوں کی سلطنت جو بحیرہ خزر اور جھیل یورال سے دریاے
 سندھ اور خلیج فارس تک پھیلی ہوئی تھی۔ اسی صدی میں تاناریوں کے ہاتھ
 سے برباد ہوئی۔ بنی عباس کی خلافت سوا پانسو برس بعد اسی صدی میں تہ تیغ
 کے لیے نیست و نابود ہوئی۔ اور بقول بعض مؤرخین کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کا خون
 مغلوں کی تلوار سے دجلے کے ریتے میں بہ گیا۔ دمشق اور اسکندریہ کا قحط جس کا

سلطان اس امر کے میں جیسا کہ شیخ نجم الدین دایہ نے مرصاد العباد کے ویجاچے میں لکھا ہے تاناریوں نے مصر
 زے اور اس کے گرد و نواح میں تقریباً سات لاکھ مسلمان قتل اور اسیر کیے تھے۔ اور عربوں
 کے جاگہ شہر تیغ۔ مرو، ہرات اور نیشاپور بالکل تاراج اور نابود ہو گئے اور ان کے وادیں بائیں اکسیر
 بستیان قتل و غارت کا نشانہ ہوئیں ÷

ذکر گشتاں اور ہوتاں میں ہے اور مصر کا قحط جس میں حسب تصریح صاحبان
ایک ایک رونی ہزار ہزار دینار کو بیک گئی اور فارس کا قحط جس میں ایک لاکھ آدمی
بھوکا مر گیا۔ اسی صدی میں واقع ہوئے۔ آنا بکان فارس کے خاندان پر اسی
صدی میں زوال آیا۔ دار الملک شیراز جو شیخ کا مولد و مسکن تھا اسی صدی
میں کئی بار قتل و غارت کیا گیا۔ فرقہ اسماعیلیہ جو پونے و دوسو برس مشرق میں
نہایت زور شور کے ساتھ حکمران رہا ان کا خاتمہ تاتاریوں نے ایران میں آ کر گردوں
نے شام میں ہمیشہ کے لیے اسی صدی میں کیا۔ یہ تمام حوادث اور وقائع شیخ
کے سامنے ظہور میں آئے تھے جن سے ایک صاحب بصیرت آدمی بے انتہا
عبرت اور نصیحت حاصل کر سکتا ہے چنانچہ ہندو کا مرثیہ جو اُس نے عربی میں لکھا ہے
اُس میں کہتا ہے ۵

دَعَى اللّٰهُ اِنْسَانًا لَا يَنْقُطُ بَعْدَ هَمِّهِ لَوْنٌ مُّضْأَبًا لَّوْ يَدِيرُ مَرْجَرَةَ الْعَمْرِ
یعنی خدا حمایت کرے اُس شخص کی جو خلافت عثمانیہ کے زواں کے بعد
متیمہ ہو گیا کیونکہ زید کی نصیبت عمرو کے لیے تازیانہ ہے +

یورپ کے مشہور مصنف ہگ ملر صاحب کا قول ہے کہ میں نے عمدہ تعلیم
صرف ایک اسکول یعنی مدرسہ روزگار میں پائی ہے۔ جس میں محنت اور نصیبت
دو بڑے گرمجوش اور دلسوز اُستاد تھے +

اس کے سوا جیسی عمدہ محنتیں شیخ کو میسر آئی تھیں وہی بہت کم آدمیوں کو ملتی
آتی ہیں۔ شیخ کی عادت جیسا کہ ایک رسالے میں اُس کے خواجے بیان سے معلوم

ہوئے یہ تھی کہ عالم سفر میں وہ جہاں جاتا تھا وہاں کے علما صلحا مثل شیخ ابوالحسن
سے ضرور ملتا تھا۔ صاحب نفحات الانس نے لکھا ہے کہ شیخ نے بکثرت سے دہشتند
در عالموں کو دیکھا تھا۔ وہ خود بھی آوستان میں کتنا ہے ۵

شیخ زہر گوشہ یا قسم زہر حشر نے خوشہ یا قسم
اگرچہ ساتویں صدی ہجری تک جس میں کہ شیخ کی جوانی اور بڑھاپا گزرا تھا مسلمانوں
کی علمی ترقیات اور فتنائل و کمالات سابق کی نسبت بہت محدود ہو گئے تھے
لیکن پھر بھی بلاد اسلام میں ایک تم غفیر اعلیٰ درجے کے مشائخ اور علما و سکنا کا
نظر آتا تھا۔ خصوصاً جن ملکوں میں شیخ کی زیادہ آمد و رفت رہی ہے جیسے ایران
روم۔ شام۔ عراق۔ عرب اور مصر وغیرہ وہ اب بھی دینی اور دنیوی علوم کے مرکز
تھے۔ چارے تذکروں سے ثابت ہوتا ہے کہ ان ملکوں میں جن لوگوں نے ساتویں
صدی ہجری کے آغاز سے آٹھویں صدی کے شروع تک وفات پائی ہے اور
جن سے شیخ کا ملنا ممکن تھا۔ ان میں کہ سے کم چار سو جلیل القدر عالم اور محقق
ایسے موجود تھے جو تمام بلاد اسلام میں مانے گئے ہیں اور جن کی تصنیفات ایک
سلمانوں میں نہایت عظمت کے ساتھ تسلیم کی جاتی ہیں۔ جیسے شیخ محی الدین
ابن العربی۔ خواجہ نصیر الدین طوسی۔ شیخ صدر الدین قنوی۔ مولانا جلال الدین
رومی۔ ابن قیمیہ حرانی۔ امام باضی۔ شیخ ابوالحسن شاذلی۔ شیخ تاج الدین قسطلانی
شیخ شہاب الدین سہروردی۔ شیخ ابن فارص۔ شیخ ابوحد الدین کرمانی۔ قاضی ابن
نسلکان شیخ الاسلام تقی الدین ابن الصلاح۔ خواجہ علاء الدین سنائی۔ علامہ
قطب الدین شہرازی۔ امام محی الدین نووی۔ قاضی ناصر الدین سیہاوی۔ عیسیٰ

فقہ شافعی وغیرہ وغیرہ ایسے سینکڑوں جلیل القدر علما اور مشائخ شیخ کی نظر سے گزر رہے تھے۔ اور ان کے علاوہ جیسا کہ گلستاں اور بوستاں سے ثابت ہوتا ہے اور ہر فرقے اور ہر گروہ کے آدمیوں سے ملتا اور ان کی صحبت سے نادمہ ناسی کرتا تھا۔ جس طرح وہ فقرا اور مشائخ کے حلقوں میں بیٹھتا تھا۔ اُسی طرح امرا کی مجلسوں اور بادشاہوں کے دربار میں شریک ہوتا تھا۔ کبھی وہ احسار اور ابرار کی صحبت سے مستفیض ہوتا تھا۔ اور کبھی ادب و دانش والوں کے مجلسوں کا قاضی تھا۔ نہ اُس کو شراب خانے میں جانے سے عار تھا نہ بت خانے میں رہنے سے تنگ تھا۔ اُسی نے جامع بعلبک میں مدتوں وعظ کیا تھا۔ اور وہی بت خانہ سومات میں ایک مدت تک چجاری رہا۔ کبھی وہ بصرے کے نخلستان میں بادلوں کے ساتھ کھجوریں توڑتا نظر آتا تھا اور کبھی فلسطین کی بستیوں میں پانیوں کو پانی پلاتا پھرتا تھا۔ غرض کہ اُس کی تمام عمر فضائل انسانی اور نیرنگیے روزگار کے مطالعہ میں بسر ہوئی تھی۔ اسی سبب سے یورپ کے بعض مصنفوں نے اُس کو کریٹ سرنسٹ کہا ہے۔ اور اسی وجہ سے اخلاق بشری کی تصویریں عمداً کے ساتھ اُس نے اپنے کلام میں کھینچی ہے ویسی کج تک ایران کے کسی شاعر سے نہیں کھی سکی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ شعراے ایران میں جس قدر عمر شیخ نے پائی ہے ظاہراً اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ جہاں تک ہماری تحقیق سے ثابت ہوتا ہے اُس نے ایک سو بیس برس اس شخص عصری میں بسر کیے ہیں۔ اگرچہ ہر علم و فن میں کمال کا درجہ حاصل کرنے کے لیے زیادہ عمر پانی

ضرور ہے۔ مگر شاعر کے لیے سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے۔ شاعر جس قدر بڑھا ہوتا جاتا ہے شاعری جوان ہوتی جاتی ہے اگرچہ شیخ رخت کے مرنے کو سچکے شاعر کی فکر میں بلند پروازی نہیں رہتی۔ لیکن بلاغت جو شاعری کا رکن اعظم ہے کمال کو پہنچتی جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ جن شاعروں نے تھوڑی عمر ہی سے گزراؤں کی قابلیت و استعداد اعلیٰ درجے کی تھی مگر ان کی شاعری میں ضرور کچھ نہ کچھ نقصان رہ گیا۔ جیسا کہ عرفی شیرازی کی نسبت شیخ ابوالفضل نے لکھی ہے کہ وہ غنیہ استعداد میں ناشگفتہ ماند، ایک نوجوان شاعر جس کی طبیعت میں کمال تجرد اور بلند پروازی ہو بالکل ایسا ہی ہے جیسے ایک شمع چالاک آکھڑ بھیرا جس کی باگ ڈور اور جست و خیز اکثر بے اصول اور خلاف قاعدہ ہوتی ہے۔ اور ایک متمرسن رسیدہ شاعر کو اُس کی فکر کیسی ہی سست اور محدود ہو اُس شایستہ اور سدہ منی گھوڑے کے مانند ہے جو کہ کسی بے مہولی قدم نہیں اٹھاتا۔ الغرض شاعری کے لیے جتنی ضروری شرائط درکار ہیں وہ سب خدا تعالیٰ نے شیخ کی ذات میں جمع کر دی تھیں :

شاعری کی بنیاد زیادہ تر چار چیزوں پر ہے۔ ایک یہ کہ شاعر کے خیالات کم و بیش کسی حقیقت و واقعہ پر نہ کہ اختراع ذہن پر مبنی ہونے چاہئیں ورنہ شعر میں کچھ تاخیر نہ ہوگی۔ دوسرے وہ ایسے خیالات ہوں جن میں عالم کے خیالات کی نسبت ایک قسم کی ندرت اور بزرالا پن اور تعجب پایا جائے ورنہ معمولی بات میں اور شعروں کی حد فرق نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ خیالات عمدہ لباس میں ظاہر کیے جائیں کیونکہ خیال کیسا ہی عمدہ ہو اگر مناسب لفظوں میں ادا نہ کیا جائے

تو دائرہ شاعری سے خارج ہو گا۔ چوتھے شاعر کے دل میں جب کہ وہ کسی مضمون پر شعر لکھ رہا ہے کم دہش اس مضمون کا جوش اور ولولہ موجو د ہونا چاہیے وہ شعر نہایت کمزور ہو گا۔ یہ چاروں باتیں جیسی شیخ کی شاعری میں پوری پوری پائی جاتی ہیں ویسی ایران کے کسی اور شاعر میں مشکل سے پائی جائیگی۔ اگرچہ بعض کے کلام میں یہ تمام خاصیتیں موجود ہیں لیکن اُن کا کلام چونکہ نہایت محدود اور ایک خاص صفت میں منحصر ہے جیسے خواجہ حافظ شیرازی غزل اور ہم اُن کو شیخ کا ہم پلہ نہیں سمجھتے۔

شیخ کو اور شعر پر اس سبب سے بھی بہت بڑی فوقیت ہے کہ اُس کی نظم و نثر دونوں مسلمہ الثبوت ہیں۔ یہ بات بظاہر عجیب معلوم ہوگی کہ ایران میں جتنے مسلمہ الثبوت شعر اگر رکے ہیں اُن میں شیخ کے سوا ایک بھی ایسا نہیں ہے جس کی نثر کو مثل نظم کے جمہور نے تسلیم کیا ہو۔ اگرچہ ہندوستان میں سکالوز اور ان ظہوری کو بھی نظم و نثر کا جامع مانتے ہیں۔ لیکن اہل ایران اُس کی نظم و نثر دونوں کو ناپسند کرتے ہیں بے شک اُس کی سہ نثر کے اکثر فقرے بادی النظر میں سائیت و لہریب ہیں جیسے

سبل حرمش از آہ تا شکمباں بتفشہ منقطہ اش از خال و لہریاب

شرح طراوت کلمات نہر مطراۃ مال آبیات خضر تشنہ لب سیرانی ادا تسماع مردہ جاں بخشی ہوا نکتہ ہائے برہمتہ غنچہ ہائے سر بہتہ - نثر و نثرہ رفت - شعر و شعر و شعر مرتب ہر صفحہ چنے و ہر سطرے تکتے و تکتے لفظ و لفظ و بارش منی بے غش و غش فصلے و ہر ز غش اصلے اسی طرح سہ نثر کے اور بہت سے فقرے الفاظ پرستوں کو ناپسند

خوشنامعلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں الفاظ کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے
 خوب اند و خوش اند و بوندارند

بجلائے اس کے شیخ نے گلستاں میں اس سے بہت زیادہ دلاویز و دلکش
 الفاظ میں حقائق و اقصیہ کو بیان کیا ہے یہ بات گلستاں کے سوا کسی فارسی
 شاعر میں آج تک نہیں دیکھی گئی +

۱۔ اندو آیدام جوانی چہاں کہ افتد وانی۔ نظرے داشتم بر دوتے و گذرے داشتم
 ہلکوتے۔ ۲۔ بے بردار حرم در پیش و حرامیاں از پس اگر رفتی بردمی و اگر رفتی
 مردی۔ ۳۔ آندہ دن دل در دشتاں ہل است و کفارہ میں ہل سم تو کہ چرخ
 نہ بینی بجرانچہ بینی۔ ۵۔ طریق در دیشاں و کر است و شکر و خدمت و طاعت
 و ایثار و قناعت و توحید و توکل و تسلیم و تحمل۔ ہر کہ بدیں صفتا موصوف است
 بحقیقت در دیش است۔ اگرچہ در قیاست۔ آنا ہرزہ گرے بے نازے ہو پرتے
 ہوس بازے کہ روز باہ شب آرد و بند شہوت۔ و شہار و زکند در خواہد غفلت
 و بخورد ہرچہ در میاں آید۔ و بگوید آئندہ بزباں آید و زنیق است اگرچہ در جہاں است۔
 ۶۔ پور را غسل بسیار است آنا پسر گرمی و راست۔ ۷۔ صہتا دے روزی و در طبع
 ماہی نگیرد و ماہی بے اجل بر خشک نیند۔ ۸۔ گوئی تخرودہ مینا بر خاکش ریختہ و
 حقہ شربت از تاکش دہد آویندہ۔ ۹۔ عصا رڈ تاکی بہ قدرش شہد فائق شدہ و قلم
 خراب برین تریش نخل باسگشتہ +

تقلم و نثر کے جامع فارسی زبان ہی میں محدود اور جو نہیں ہیں بلکہ ہر ایک زبان
 میں ہی حال ہے۔ انگریزی میں باوجودیکہ لٹریچر کی ترقی اتنا کے مدد سے کہ پہنچ گئی ہے۔

صرف گنتی کے آدمی ایسے ہیں جن کو نظم و نثر دونوں میں تمام اہل فن کے نزدیک قبولیت حاصل ہوئی ہے بعضے لطیف کو اور بعضے سکاٹ کو اور بعضے اور ایک آدمی کو نظم و نثر کا جامع خیال کرتے ہیں۔ پس شیخ کے لیے یہ کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے کہ ایران میں صرف اسی کی نظم و نثر دونوں ایسی ہیں جن کو اہل زبان نے تسلیم کیا ہے :

شیخ نے بھی تغزل یعنی عاشقانہ اشعار کی بنیاد تمام شعراے ایران کی طرح اُمردوں اور سادہ رخنوں کے عشق ہی پر رکھی ہے۔ لیکن یہ بات جیسی کہادی نظر میں مذموم اور قبیح معلوم ہوتی ہے حقیقت میں ایسی نہیں ہے اور صرف اس بنا پر شیخ یا ایران کے اور شعرا پر اُمرد پرستی کا الزام لگانا بجا ہے۔ فارسی بان میں اور اُس کی پیروی سے اردو زبان میں بھی ہمیشہ سے شاعری کا یہ طریقہ نہا ہے کہ شاعر مرد ہو یا عورت۔ رند ہو یا صوفی۔ خدا کا عاشق ہو یا مخلوق کا۔ مرد کا عاشق ہو یا عورت کا۔ بلکہ مبرے سے عاشق ہو یا نہ ہو۔ ہمیشہ غزل ایسے عنوان سے لکھتا ہے جس سے معلوم ہو کہ شاعر کسی پر عاشق ہے اور وہ اور اس کا معشوق دونوں مرد ہیں۔ اسی طرح ہندی میں شاعر مرد ہو یا عورت۔ دنیا دار ہو یا نازک الونیا۔ عشق حقیقی رکھتا ہو یا عشق مجازی۔ مرد کا عاشق ہو یا عورت کا۔ ہمیشہ عشقہ نظم ایسے طور پر لکھتا ہے جس سے ثابت ہو کہ شاعر عورت ہے اور اُس کا معشوق مرد ہے اسی طرح عربی میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو عورت فرض کر لیتا ہے۔ اگر بالفرض کوئی شخص تینوں زبانوں میں شعر کہنے پر قادر ہو تو اُس غریب کو ہر زبان کے دستور کے موافق کہیں آپ کو مرد اور معشوق کو عورت اور کہیں آپ کو عورت اور معشوق

کو مرد ہو رکھیں آپ اور معشوق دونوں کو مرد قرار دینا پڑیگا۔ حضرت امیر خسرو دہلوی کی فارسی غزلوں سے صاف یہ پایا جاتا ہے کہ وہ کسی سادہ خیال کے پرمغفوں ہیں اور ان کے ہندی دو ہڑوں سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی عورت اپنے پیارے خاوند یا دوست کے عشق یا جدائی میں مبتلا ہے۔ اور عربی قصائد کی تشبیہوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مرد اپنی زوجہ یا محبوبہ کی یاد میں مضطرب قرار ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ تمام فرضی اور اصطلاحی عنوان بیان ہیں جن کو حقیقتِ اُمّی سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ جس طرح ہزاروں پارسا اور پرمیزگار شاعر جنہوں نے نہ کبھی شرب کا مزا چکھا نہ اس کی صورت دیکھی نہ اس کی بونگھی۔ صدا با شعر شراب و کباب کے حصوں کے لکھتے ہیں۔ اسی طرح ہزاروں پاک باز اور صاحبِ عفت شاعر لکھتے وقت تھوڑی دیر کو آبرؤ پرست اور شاہد بازن جانتے ہیں۔ البتہ اس سے مشرقی شاعری کی حد سے زیادہ بے اعتباری پائی جاتی ہے جس کے اصول اور فروع سب تصنع اور بناوٹ اور آواز عاے محض پر مبنی ہیں۔ لیکن شیخ سعدی اور مولانا روم اور اخیر خسرو اور خواجہ حافظ اور تمام شعراے متصوفین اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ یہ لوگ اکثر عشق مجازی کے پیرایے میں اپنے واردات اور حالات اور حقائق و اقیحہ بیان کرتے ہیں بعض اشخاص یہ خیال کرتے ہیں کہ ان لوگوں کے کلام کو جس میں بظاہر تمام خال و خط اور شراب و شاہ کے مضامین درج ہیں حقیقی معنوں پر محمول کرنا اور اس سے شاہِ حقیقی کے شیون و صفات مراد یعنی صرف ایک نکالنا نہ محض ہے جس میں سراسر تکلف اور بناوٹ پائی جاتی ہے۔ مگر ایسا خیال وہی ٹول کر سکتے ہیں جو کوچہ شعری سے نا بلند ہیں۔ گناہ یہ ہمیشہ مراحت سے زیادہ ملین ہوتا ہے اور دوست کا ذکر

ہمیشہ اعتبار سے چھپایا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا روم مثنوی میں صاف صاف فرماتے ہیں :

خوشتر آں باشد کہ ستر دلیراں گفتہ آید در حدیث دیگران
شعراے متصوفین کے اشارہ اگر حقیقی معنوں پر محمول نہ کیے جائیں تو ان میں دو کثر مشہور ہیں جس نے ایک عالم کے دل کو تسخیر کیا ہے باقی نہیں رہتا۔ نغماتِ لائس میں لکھا ہے کہ مولانا محمد شیریں جو کہ مولانا مغربی کے نام سے مشہور ہیں اور جن کا دیوان غزلیاتِ متصوفانہ شعرا میں مشہور ہے ان کے سامنے کسی نے ان کے معاصر شیخ کمال اسماعیل مخمندی کا یہ مطلع پڑھا ہے :

چشمِ اگرین ست و ابرو دینِ دناز و عشوہ ایں اوداع اسے دُہر و تقوے افراق لے عقل و دین
مولانا نے سن کر کہا ایسا شعر کتنا کیا ضرور ہے جو سنی مجازی کے سوا کوئی اور محفل نہ رکھتا ہو۔ شیخ نے بھی یہ بات سنی اور ایک موقع پر مولانا کے سامنے ذکر چھڑ کر کہا کہ چشم اور عین مراد لفظ ہیں۔ پس عین سے ذاتِ الہی مراد لی جاسکتی ہے۔ اور ابرو جب کلام مراد ہے پس محکم ہے کہ حاجب سے صفاتِ الہی جو کہ حاجب ذات ہیں مراد لیے ہیں۔ مولانا نے اس توجیہ کو تسلیم کیا اور شیخ کے بیان کی داد دی۔ خواجہ حافظ کی نسبت اُسی کتاب میں لکھا ہے کہ یہ شخص لسانِ الغیب اور ترجمانِ الاسرار ہے۔ اس نے اکثر اسرارِ غیبی اور معانی حقیقی مجازی کے لباس میں ایسی خوبی سے بیان کیے ہیں کہ کسی اور سے ایسا بیان نہیں ہو سکا۔ پھر اکابرِ صوفیہ میں سے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے جو کہ صوفیہ کے حق میں دیوانِ حافظ کو تمام دیوانوں سے بہتر بتاتے تھے۔ لیکن حق یہ ہے کہ تہذیب کا یہ طریقہ خواجہ حافظ وغیرہ نے شیخ سعدی شیرازی کے

نتیجہ سے چل گیا ہے :

البتہ ایران کی شاعری میں یہ بات قابل غور ہے کہ انھوں نے نقل کی بنیاد
 آمد پرستی پر کیوں لکھی ہے۔ عرب کی شاعری میں شاعر اپنے تئیں مرد اور معشوق کو
 عورت اور ہندی میں اپنے کو عورت اور معشوق کو مرد بانڈھتے ہیں اور یہ دونوں لیتے
 بیچر کے مطابق ہیں۔ مگر مرد کا مرد پر عاشق و فریفتہ ہونا اور اُس سے وصل کا طالب
 اور کا نحو ہونا اگرچہ محض زبانی جمع خنج کیوں نہ ہو ایک ایسا طریقہ ہے جس سے فطرت
 انسانی بالکل ابا کرتی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فارسی
 زبان میں عربی اور ہندی زبان کی طرح تذکیر و تانیث کا تفرقہ نہیں ہے۔ اُس میں
 ضمیریں اور افعال اور صفات مرد اور عورت دونوں کے لیے یکساں لائی جاتی
 ہیں۔ پس ممکن ہے کہ قدیم فارسی میں بھی ہندی کی طرح شعرا اپنے تئیں عورت
 اور معشوق کو مرد بانڈھتے ہوں۔ لیکن اس سبب سے کہ شاعر عموماً مرد ہوتے تھے اور
 صنائی یا افعال وغیرہ سے یہ ثابت نہ ہوتا تھا کہ شاعر نے اپنے تئیں مرد فرض کیا ہے
 یا عورت۔ رفتہ رفتہ یہ خیال پیدا ہو گیا ہو کہ فارسی میں عاشق اور معشوق دونوں
 فرض کیے جاتے ہیں۔ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر کامل غور اور توجہ سے دیکھا جائے
 تو یہ ایک ایسی توجیہ ہے جس کے صحیح ہونے میں کچھ حقور ابھی سانشبہ باقی رہ جاتا ہے۔
 اس کے سوا دوسری وجہ یہ بھی خیال میں آتی ہے کہ جب سلمان عرب سے نکل کر
 اطراف و جوانب میں پھیلے تو بسبب اس کے کہ اُن کے ہاں عورتوں کا مردوں سے
 چھپا نام نہ ہی فراتس میں سے تھا۔ عورتوں کے میل جول سے عورتوں کے باب
 میں اُن کی غیرت حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ خصوصاً مسلمان بادشاہوں میں

اس غیرت کا ظہور سب طبقوں سے زیادہ تھا۔ ڈاکٹر برنیر فرانسسیسی جو ہندوستان میں پندرہ سولہ برس عالمگیر کے ساتھ رہا ہے اپنے وقائع سفر میں لکھتا ہے: ”ہندوستان میں جب بادشاہ سفر کرتا تھا تو بیگمات کی سواری کے نزدیک اس شخص سے گفتگو کی جاتی تھی۔ وہی رتبہ اور صاحبِ اعتبار ہونے سے پتا تھا۔ بالضرور خواجہ سراؤں اور خواصوں کے ہاتھ سے نہایت بے رحمی کے ساتھ پٹتا تھا۔“ اور ایراں میں سنا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص بیگمات کی سواری سے آگے فرسنگ کے فاصلے پر نظر پڑ جاتا تھا تو اس کی سزا موت کے سوا کچھ نہ تھی اور جس شہریا گاؤں میں سے بیگمات کی سواری نکلتی تھی وہاں کے تمام مرد اور عورت اپنے اپنے مقام اور سکن چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ شاید اس بیان میں کچھ مبالغہ ہو مگر اس سے یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ عورتوں کے باب میں مسلمان بادشاہوں کی غیرت حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ چونکہ شعرا اکثر بادشاہوں کی مداح اور مصاحب ہوتے تھے اس لیے وہ کوئی بات سلاطین کے مقتضائے کے خلاف شعر میں درج نہ کر سکتے تھے۔ پس نہایت قوی گمان ہے کہ شعرا نے خود اور تشبیب میں عورتوں کے حسن و جمال کا ذکر اور جو معاملات عشق کے زمانہ عاشق و معشوق کے درمیان واقع ہوتے ہیں ان کو صاف صاف بیان کرنا اس کی حیثیت اور غیرت کے برخلاف سمجھا دیا۔ اور اس لئے تمام عشقیہ مضامین مردوں اور سادہ رُخوں پر ڈھلے گئے ہوں۔ سلاطین مغلیہ میں سے جہانگیر کے عہد میں جو ایک واقعہ گزرا ہے وہ اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ ایک موقع پر جہانگیر کے زہر و قوال امیر خسرو علیہ الرحمۃ کی قزل گارہ تھا اور بادشاہ اس کو سن کر بہت محظوظ

درہا تھا۔ جب تو آل نے یہ شعر گایا

تو شانہ مے نمائی بہر کہ بودی شب کہ ہنوز چشم مست از خمار دارد
 بادشاہ دفعہ بگڑ گیا اور تو آل کو فوراً پٹا کر نیکو ادا دیا اور اس قدر برہم ہوا کہ تمام ندیم
 اور خواص خوف سے لرزنے لگے اور ملا نقشی مہر کن کو جن کا بادشاہ بہت لحاظ کرتا
 تھا بلا کر لائے تاکہ وہ کسی تدبیر سے بادشاہ کے مزاج کو دھما کریں۔ جب وہ سامنے
 آئے تو بادشاہ کو نہایت غیظ و غضب میں بھرا ہوا پایا۔ عرض کیا۔ حضور خیر باشد!
 بادشاہ نے کہا دیکھو! امیر خسرو نے کیسی بے غیرتی کا مضمون شعر میں بلانہا ہے۔
 بھلا کوئی غیرت مند آدمی اپنی محبوبہ یا منکوحہ سے ایسی بے غیرتی کی بات کہہ سکتا
 ہے؟ ملا نقشی نے ایک نہایت عمدہ توجیہ سے اُسی وقت بادشاہ کا غصہ
 ٹھوکر دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ امیر خسرو نے چونکہ ہندوستان میں نشوونما پایا تھا
 اس لیے وہ اکثر ہندوستان کے اصول کے موافق شعر کہتے تھے۔ یہ شعر بھی اُنہوں
 ضے اُسی طریقے پر کہنا ہے۔ گویا عورت اپنے شوہر سے کتنی ہے کہ نورات کو کسی
 یا عورت کے ہاں رہا ہے کیونکہ اب تک تیری آنکھوں میں نشے یا فیند کا غما
 جاتا ہے۔ یہ سن کر بادشاہ کا غیظ و غضب فوراً جاتا رہا اور پھر گانا بھی ناہونے لگا۔
 تو اگرچہ شیخ یا اور شعرا نے ایران کے عاشقانہ استعارے جیسا کہ ہم اوپر بیان
 پہلے ہیں ان کی آمد پرستی اور شاہ بازی پر استدلال نہیں جو سکتا۔ لیکن اس کتاب
 میں نہیں کہ گفتاں کے پانچویں باب کی بعض حکایتوں اور نیز شیخ کے اکثر استعار
 سے صاف پایا جاتا ہے کہ عشق و محبت اُس کی سرشت میں تھا اور کسی نہ کسی وقت
 ہی اُس کو سادہ رُخوں اور اُردوں کی طرف میلان خاطر رہا ہے۔ مگر اس بات کو

میں کسی بڑے معنی پر محمول نہیں کرتا۔ صوفیہ کے حالات جو نفعات وغیرہ میں لکھے
 ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے نزدیک عشق مجازی بشرطیکہ پاک اور بے مہیب
 ہو۔ سالک کے لیے ایک بہت بڑا ذریعہ ترقی باطنی کا ہے اور اکثر بڑے بڑے مشائخ
 اور عرفا میں یہ خصلت پاکدامنی اور عفت کے ساتھ دیکھی گئی ہے۔ شیخ نے جس
 طرح اپنے عاشق مزاج ہونے کا ہاجا اقرار کیا ہے اسی طرح ناپاک عشق بازی اور
 ہوا دہوس سے بے بیویں جگہ اپنی برأت بھی کی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ عنبر میں
 لکنا ہے ۵

گو نظر صدق را نام گنہ سے مند
 حاصل با بیچ نیست جز گنہ اندوختن

مقتدۃ ————— بآئینہ ————— یزیر

